اس انجمنِ گل میں شعلے بھی ہیں شبنم بھی
شعلہ و شبنم
جوش ملیح آبادی
کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی
کتبہ محمد شریف عباسی لاہور
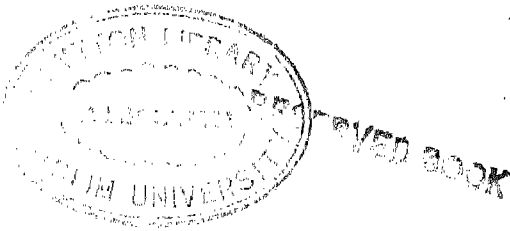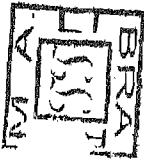
مطبوعہ
اعظم اسٹیم پریس اعظم بلڈنگ حیدرآباد
(دکن)

تہدیہ

اے رُوحِ عصرِ حاضرِ ہندوستاں تُو — لایا ہے اک صحیفۂ سخنداں ترے لئے

اِس مصحفِ عظیم کی اللہ ری وسعتیں — ہر بند ہے شفقیں بداماں ترے لئے

ہر منظرِ حیات کو دیکھا ہے غور سے — چھوڑا نہیں ہے ایک بھی عنواں ترے لئے

دِکھتی ہے جس مقام پہ رُوح الامیں کی سانس — دل کو وہاں کیا ہے پرافشاں ترے لئے

لایا ہوں بزم و رزم کی ارضِ تضاد سے — یہ بلبلِ جنگ و سازِ شبستاں ترے لئے

کتنی شبوں کے طاق میں رکھکر چراغِ دل — پرکھی ہے رُوحِ عالمِ امکاں ترے لئے

اِس کی خبر بھی ہے کہ بنایا گیا ہے لحن — کتنی شبوں کا گریۂ پنہاں ترے لئے

ڈھالے ہیں مرغزار و گلستاں کی شکل میں — کتنے مہیب و تیرہ بیاباں ترے لئے

گوندھی گئی ہے تارِ سخن میں خبر بھی ہے — کن مہوشوں کی زلفِ پریشاں ترے لئے

کس کو خبر تراش کے کن ظلمتوں کا دِل — لایا ہوں میں یہ چشمۂ حیواں ترے لئے

میں تجھ سے کیا کہوں کہ سخن میں کیا ہے حل — کس شوخ کا تبسمِ پنہاں ترے لئے

واقف بھی ہے کہ موجِ سخن میں پچی ہے صرف — کن انکھڑیوں کی جنبشِ مژگاں ترے لیے

لایا ہوں وزن و شعر کی منزل میں کیا کہوں — کیونکر جراحتِ دلِ انساں ترے لیے

تعبیر کی ترازوئے نرمِ نہفتہ میں — تولے ہیں کتنے خوابِ پریشاں ترے لیے

کیا پوچھتا ہے جوشؔ کی بربادیوں کا حال
پُرزے ہے کب سے جیب و گریباں ترے لیے

سنہ ۱۹۳۶ء

فہرست

باب اوّل "آتشکدہ"

باب سوم "اسلامیات"

بادۂ سرجوش

آتشکدہ

خواب کو جذبۂ بیدار دئے دیتا ہوں

قوم کے ہاتھ میں تلوار دئے دیتا ہوں

کام ہے میرا تغیّر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

پیمانِ محکم

قسم اُن غازیوں کی موت سے جو جنگ کرتے ہیں
اپنی تلوار کی بُرّش سے جن کے زخم بھرتے ہیں

قسم اُن کی جو ہنس کر خون میں اپنے نہاتے ہیں
خوشی سے رن میں ڈٹ کر منہ پہ تلواریں جو کھاتے ہیں

قسم اُن کی نظر نیزہ بُرّساں سے جن کی لڑتی ہے
اکڑ جاتے ہیں طبلِ جنگ پر جب چوٹ پڑتی ہے

قسم اُس نور کی بخشا گیا تھا جو رسالت کو
قسم اُس سوزِ پنہاں کی جو ملتا ہے محبت کو

قسم اُس برق کی جو گر کے خرمن پھونک دیتی ہے
قسم اُس موت کی جو خنجروں میں سانس لیتی ہے

قسم ہے اُس کماں کی جو سرِ میداں کڑکتی ہے
قسم اُس آگ کی جو قلبِ شاعر میں بھڑکتی ہے

قسم اُس زخم خوردہ شیر کی خونی ڈکاروں کی
گرج سے جس کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں کچھاروں کی

قسم اُس جذبۂ غیرت کی جو آزاد کرتا ہے
قسم اُس طنطنے کی جس پہ ہر خود دار مرتا ہے

قسم اُس شعلۂ غم کی جو فرقت میں بھڑکتا ہے
قسم ہے اُس لہو کی چشمِ تر سے جو ٹپکتا ہے

قسم اُس گھن گرج پُر ہول توپوں کے دہانوں کی
گرج سے جن کی ہل جاتی ہیں بنیادیں چٹانوں کی

قسم اُس کھڑکھڑاہٹ کی زرہ سے جو نکلتی ہے
قسم اُن زمزموں کی جن کی رَو پر فوج چلتی ہے

قسم گھوڑوں کی اُن ٹاپوں کی، جو رن کو ہلا تی ہیں ‏— سروں پر گرد کا اک خونچکاں بادل بناتی ہیں

قسم اُس سانس کی، جو موت کے ہنگام چلتی ہے ‏— قسم اُس وقت کی، جب زندگی کروٹ بدلتی ہے

قسم اُس عزم کی، سادات جب میدان میں جاتے ہیں ‏— دمِ رخصت عروسِ نو کا جب گھونگٹ اٹھاتے ہیں

قسم اُس کی، ثبوت اپنی شرافت کا جو لاتا ہے ‏— نسب نامے پر اپنے خون کی مُہریں لگاتا ہے

قسم اے موت اُن کی، رنگ تیرا جو اڑاتے ہیں ‏— تری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جو مسکراتے ہیں

قسم اُن قوتوں کی، جو ملی تھیں رام و لچھمن کو ‏— قسم اُس آگ کی، جو کھا گئی تھی ملکِ راون کو

قسم اُس نور کی، روشن تھے جاتے جس سے صحرا کے ‏— جھمکتا تھا جو ٹیکے کی طرح ماتھے پہ سیتا کے

قسم اُس ضرب کی، توڑا تھا جس نے بابِ خیبر کو ‏— قسم اُس شیر کی، جس نے پچھاڑا تھا عنتر کو

قسم اُس پیاس کی، کوثر کی رَو پر جس کا قبضہ تھا ‏— قسم اُس ابر کی، جو کربلا میں گھر کے برسا تھا

قسم اُس تیر کی، چلتا تھا جو چٹکی سے ارجن کی ‏— قسم میدان میں گاتی ہوئی تلوار کی دھن کی

قسم اُس جوش کی، جو ڈوبتی نبضیں ابھارے گا ‏— کہ اے ہندوستاں! جیسے ہی تو مجھ کو پکارے گا

مری تیغ رواں، باطل کے سر پر جگمگائے گی
ترے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائے گی

۱۹۳۳ء

غلاموں سے خطاب

اے ہند کے ذلیل غلامانِ رُوسیاہ!
شاعر سے تو مِلاؤ خدا کے لئے نگاہ

اِس خوفناک رات کی آخر سحر بھی ہے؟
توپیں گرج رہی ہیں سروں پر خبر بھی ہے؟

اے اُمّتِ شکستہ دل و اے گروہِ شل!
کب سے بُلا رہا ہوں میں تجھ کو سوئے عمل!

تجھ پر مرے کلام کا ہوتا نہیں اثر
چونکا رہا ہوں کب سے میں شانے جھنجھوڑ کر

حالانکہ میرا شعر ہے وہ حرفِ تند و تیز
طوفاں بدوش و صاعقہ پیما و حشر خیز

ضد پر جو آئے بات میں پتھر کو توڑ دے
حرف اِک صدا سے گنبدِ بے در کو توڑ دے

چاہے تو زمہریر سے اُڑنے لگیں شرار
گلبرگِ تر کے بطن سے پیدا ہو ذوالفقار

اُکسائے میرا شعر اگر جذبہ ہائے جنگ
پیدا ہو آبگینے کے اندر مزاجِ سنگ

خرمن میں میرا شعر اگر کج کرے کُلاہ
خس تُند بجلیوں سے لڑانے لگے نگاہ

آہن کے جوہروں سے ٹپکنے لگے شراب
پیری کی ہڈیوں میں مچلنے لگے شباب

تجھ کو یقیں نہ آئے گا اے دائمی غلام!
میں جا کے مقبروں میں سناؤں اگر کلام

خود موت سے حیات کے چشمے اُبل پڑیں
قبروں سے سر کو پیٹ کے مُردے نکل پڑیں

میرے رجز سے لرزہ براندام ہے نہیں افسوس تیرے کان پہ جوں رینگتی نہیں
تو چُپ رہا، زمین ہلی، آسماں ہلا تجھ سے تو کیا، خدا سے کروں گا میں یہ گلا
اِن بزدلوں کے حُسن پہ شیدا کیا ہے کیوں؟
نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں؟

۱۹۳۳ء

ترکِ جمود

ہر اک کے واسطے یہ نازشِ دوام کہاں نبردِ عشق کہاں جرأتِ عوام کہاں
تڑپ کے مجھ کو پکارا ہے ملک و ملّت نے اب آج سے مجھے پروائے ننگ و نام کہاں
ہوا ہے حکم کہ لے کام موجِ صرصر سے اب اختلاطِ نسیمِ سُبک خرام کہاں
کہا گیا ہے کہ پی لہو نیم روز سے مے اب انتظامِ شبِ ماہ و دورِ جام کہاں
عطا کیا ہے مشیّت نے نظمِ دشت و جبل دماغِ عشق کو اب فکرِ سقف و بام کہاں
نظر ہے اوج پہ جنبش میں ہیں پرِ پرواز بساطِ خاک پر اب فرصتِ قیام کہاں
نظر ہے جلوۂ عالم کی ناتمامی پر اب اعتبارِ رجالِ مرتمام کہاں
سرِ نیاز ہے خم پیشِ پختگانِ جنوں اب احترامِ دل افسردگانِ خام کہاں

نگاہ میں ہے جوانانِ برق رَو کی روش
اب اقتدائے حریفانِ نرم گام کہاں

ہٹا ہے حکم کہ بن رازدانِ آتش و برق
اب آب چہرۂ خوبانِ لالہ فام کہاں

تغیّرات کی رَو سے گزر رہی ہے نگاہ
اب اہتمامِ تماشائے حُسنِ بام کہاں

لبِ حیات نے چھیڑا ہے قصّۂ خونیں
مری زبان کو اب رخصتِ کلام کہاں

چلا ہوں سر بکف اُس سمت آج خود ہی جوشؔ
اب آرزو کو سرِ نامہ و پیام کہاں

۱۹۲۵ء

نعرۂ شباب

(بوڑھے لیڈروں کی انجمن میں)

ہوشیار! اپنی متاعِ رہبری سے ہوشیار
اے جنوں ناآشنا پیری و شیب ہرزہ کار!

اُڑ گیا رُخ سے نگارِ آسماں سے رنگِ خواب
جھلملاتی شمع! رخصت ہو کہ اُبھرا آفتاب

ہٹ! کہ اب سعی و عمل کی راہ میں آتا ہوں میں
خلق واقف ہے کہ جب آتا ہوں چھا جاتا ہوں میں

اے قدامت! دیکھ کھلی ہے سامنے راہِ فرار
بھاگ وہ آیا نئی تہذیب کا پروردگار!!

کام ہے میرا تغیّر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ "انقلاب" و "انقلاب" و "انقلاب"

کوئی قوت راہ سے مجھ کو ہٹا سکتی نہیں — کوئی ضربت میری گردن کو جھکا سکتی نہیں

زنگ سورج کا اڑاتا ہے مرے سینے کا داغ — بادِ صرصر کا بدل دیتا ہے رُخ میرا چراغ

سنگ و آہن میں مری نظروں سے چھد جاتی ہے پھانس — آندھیوں کی میرے میداں میں اکھڑ جاتی ہے سانس

دیکھ کر میرے جنوں کو ناز فرماتے ہوئے — موت شرماتی ہے میرے سامنے آتے ہوئے

الاماں کبڑی، ریا آلودہ پیری! الاماں — اب کڑکتی ہے ترے سر پر جوانی کی کماں

ہو چکی غیرت ڈوب مر، یہ عمر، یہ درسِ جنوں! — دشمنوں کی خواہشِ تقسیم کی صیدِ زبوں!

یہ ستم کیا، اے کنیزِ "کفر و ایماں" کر دیا؟ — بھائیوں کو گائے اور باجے پہ قرباں کر دیا

کر دیا طولِ غلامی نے تجھے کوتہ خیال — جھریاں ہیں یہ ترے منھ پر کہ غداری کا جال

دیکھتی ہے صرف اپنے ہی کو اے دھندلی نگاہ — سر بھڑک اٹھا ہے لیکن دل ابھی تک ہے سیاہ

پوپلے منھ، اے ستم گر "عاقبت بینی" کا شور — دیکھ اب بزدل! مری "ناعاقبت بینی" کا زور

چہرۂ "امروز" ہے میرے لیے ماہِ تمام — خوفِ "فردا" ہے مری رنگیں شریعت میں حرام

تیر جاتی ہے دلِ فولاد میں میری نظر — خون میرا خندہ زن ہنستا ہے موجِ برق پر

اور تمنائیں ہیں تیری سسکیاں بھرتی ہوئی — اونگھتی، کڑھتی، بلکتی، کانپتی، ڈرتی ہوئی

تیری باتوں سے پڑی جاتی ہے کانوں میں خراش — "کفر و ایماں" "کفر و ایماں" تا کجا؟ خاموش باش

حُبِّ انساں، ذوقِ حق، خوفِ خدا کچھ بھی نہیں — تیرا "ایماں" چند وہموں کے سوا کچھ بھی نہیں

تیرے جھوٹے "کفر و ایماں" کو مٹا ڈالوں گا میں — ہڈیاں اس "کفر و ایماں" کی چبا ڈالوں گا میں

بے آگ جو چڑھتا ہے وہ پارا نہیں ہوتا   بے وجہ نہیں کشمکشِ کافر و دیندار

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار!

بیدار رہو بیدار!!

مرہم ابھی طیّار نہیں، زخم رسیدہ   افسوس ہے اے صاحبِ اوصافِ حمیدہ
"گرگِ دہن آلودہ و یوسف نہ دریدہ"   اے مصر کے بازار میں یوسف کے خریدار

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو بیدار!

بیدار رہو بیدار!!

اب تک تری محرومیِ تقدیر وہی ہے   بدلے ہوئے الفاظ ہیں تفسیر وہی ہے
گو روپ تو زلفوں کا ہے، زنجیر وہی ہے   ہر حلقۂ کاکل میں ہے زنجیر کی جھنکار

بیدار رہو بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار!

بیدار رہو بیدار!!

یک رنگ ہے جو جیت ہے، دنیا میں اُسی کی   اے صیدِ کشاکش! یہ دو رنگی نہیں اچھی
یا اپنے کفِ پا میں لگا ناز سے مہندی   یا جامۂ ہستی کو بنا خوں سے گلنار

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار!

بیدار رہو، بیدار!!

دم بھر تو کبھی غور کر اے خفتۂ مقدر!   مادہ تجھے قدرت نے بنایا ہے کہ ہے نر

یا اوڑھ لے اے زہرہ جبیں! مقنع و چادر یا کھینچ لے اے مردِ خدا! میاں سے تلوار

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار!

بیدار رہو! بیدار!

یا حجلۂ رنگیں میں دکھا عشوۂ پُرفن یا رن میں کچھ اس شان سے آ گونج اُٹھے رن
یا گوندھ کے چوٹی کو پہن پھولوں کے کنگن یا سر سے کفن باندھ کے مرنے پہ ہو طیار

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار!

بیدار رہو! بیدار!

یا فرشِ عروسی پہ بدل ناز سے پہلو یا عرصۂ جرأت میں دکھا قوتِ بازو
یا رقص کی محفل میں بجا تال سے گھنگرو یا جنگ کے میداں میں سنا تیغ کی جھنکار

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار!

بیدار رہو! بیدار!

۱۹۲۹ء

کِسان

جھٹپٹے کا نرم رَو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروبِ آفتاب

دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ
دُور دریا کے کنارے دھندلے دھندلے سے چراغ

زیرِ لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنُود
مشعلِ گردُوں کے بُجھ جانے سے اِک ہلکا سا دُود

وسعتیں میدان کی سورج کے چھپ جانے سے تنگ
سبزۂ افسردہ پر خواب آفریں ہلکا سا رنگ

خامُشی اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا
شام کی خنکی سے گویا دِن کی گرمی کا گِلا

اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا
تیرگی میں کھیتیوں کے درمیاں کا فاصلا

خار و خس پر ایک درد انگیز افسانے کی شان
بامِ گردوں پر کسی کے رُوٹھ کر جانے کی شان

دُوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اِک سرور
چرخ پر بادل، زمیں پر تتلیاں، سر پر طُیور

پارہ پارہ ابر، سُرخی، سُرخیوں میں کچھ دھُواں
بھُولی بھٹکی سی زمیں، کھویا ہوا سا آسماں

پتّیاں مخمُور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہُوئی
نرم جاں پَودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

یہ سماں، اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار

طفلِ باراں، تاجدارِ خاک، امیرِ بوستاں
ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں

ناظرِ گُل، پاسبانِ رنگ و بُو، گلشن پناہ — نازپرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
وارثِ اسرارِ فطرت، فاتحِ اُمیّد و بیم — محرمِ آثارِ باراں، واقفِ طبعِ نسیم
صُبح کا فرزند، خورشیدِ زرافشاں کا عَلم — محنتِ پیہم کا "پیماں" "سخت کوشی کی قسم"
جلوۂ قدرت کا شاہد، حُسنِ فطرت کا گواہ — ماہ کا دِل، مہرِ عالم تاب کا نُورِ نگاہ
قلب پر جس کے نمایاں نُور و ظلمت کا نظام — مُنکشف جس کی فراست پر مزاجِ صبح و شام
خُون ہے جس کی جوانی کا بہارِ روزگار — جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسّم کا مدار
جس کی محنت کا عرق طیّار کرتا ہے شراب — اُڑ کے جس کا رنگ بنجاتا ہے جیلِ پرورِ گلاب
قلبِ آہن جس کے نقشِ پا سے ہوتا ہے رقیق — شعلہ خُو جھونکوں کا ہمدم تیز کرنوں کا رفیق
خُون جس کا بجلیوں کی انجمن میں باریاب — جس کے سر پر جگمگاتی ہے کُلاہِ آفتاب
لہر کھاتا ہے رگِ خاشاک میں جس کا لہُو — جسکے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیلِ رنگ و بُو
دَوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر — دِن کو جس کی اُنگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر
جس کی جانکاہی سے ٹپکاتی ہے امرت نبضِ خاک — جس کے دَم سے لالہ و گُل بنکے اڑتی ہے خاک
سازِ دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ! — مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے رُوئے شاہ
خون جس کا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں — لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں
جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عزّ و وقار — کرتی ہے دریوزۂ تابش کُلاہ تاجدار
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی — جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی

جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ

جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار

جس کے کس بل پہ اکڑتا ہے غرورِ شہریار

دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں

ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل

سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل

کون ہل؟ ظلمت شکن قندیلِ بزمِ آب و گِل قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل

خوش نما شہروں کا بانی، رازِ فطرت کا سراغ خاندانِ تیغ جوہر دار کا چشم و چراغ

دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام شامِ زیرِ ارض کو صبحِ درخشاں کا پیام

ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا مضمحل ذرّوں کی موسیقی کو چونکاتا ہوا

جس کے چھو جاتے ہی مثلِ نازنینِ مہ جبیں کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں

پردہ ہائے خواب ہو جاتے ہیں جس سے چاک چاک مسکرا کر اپنی چادر کو ہٹا دیتی ہے خاک

جس کی تابش میں درخشانی ہلالِ عید کی خاک کے مایوس مطلع پر کرن امّید کی

جس کا مَس خاشاک میں بنتا ہے اِک چادر مہین

جس کا لوہا مان کر، سونا اُگلتی ہے زمین

ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سرخیاں اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں

اُس سیاسی رتھ کے پہیّوں پر جاتی ہے نظر　　جس میں آ جاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر

اپنی دولت کو جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے　　دیکھتا ہے ملکِ دشمن کی طرف جاتے ہوئے

قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیِ حرماں سے راہ　　فاقہ کش بچّوں کے دھندلے آنسوؤں پہ ہے نگاہ

پھر رہا ہے خونچکاں آنکھوں کے نیچے بار بار　　گھر کی ناآسودہ دیوی کا شبابِ سوگوار

سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا　　بے ردا بیوی کا سر، بچوں کا منھ اُترا ہوا

سیم و زر، نان و نمک، آب و غذا، کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

ایک دل، اور یہ ہجومِ سوگواری! ہائے ہائے　　یہ ستم اے سنگدل سرمایہ داری ہائے ہائے

تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں شقاوت کے شرار　　جن کے آگے خنجرِ چنگیز کی مُڑتی ہے دھار

بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہاتھ　　کیا چبا ڈالے گی او کم بخت! ساری کائنات

ظلم اور اتنا! کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی　　بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی

دیکھ کر تیرے ستم اے حامیِ امن و اماں!　　گُرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں

ادّعائے پیرویِ دین و ایماں، اور تُو!　　دیکھ اپنی کہنیاں، جن سے ٹپکتا ہے لہو

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہلِ دل کے آب ہیں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لئے بے تاب ہیں

۱۹۲۹ء

زوالِ جہانبانی

مبارک ہیں مبارک دشمنوں کے جورِ پنہانی
کہ مشکل کردئیں لے لے کے بنجاتی ہے آسانی

تجھے معلوم ہے؟ تاریکیاں بڑھتی ہیں جب حد سے
اُبلنے لگتی ہے ذرّاتِ خاکی سے درخشانی

دیارِ مصر میں برسوں مسلسل قحط پڑتے ہیں
کہیں ہوتی ہے جب شاداب کشتِ پیرِ کنعانی

منقّش ہو نہ جب تک دیدۂ خونبار سے چہرہ
نہیں کھلتی عروسِ رنگ و بو کی چینِ پیشانی

سمجھنا بھی ہے کیوں غنچوں کے سینے چاک ہوتے ہیں؟
شگوفوں کو ہے اِس پردے میں دسترسِ عطرافشانی

نہاتی ہیں لہو میں جب بہاریں حبِّ قومی کی
تو ہوتا ہے شگفتہ لالہ زارِ حبِّ انسانی

ہزاروں آسماں جب سر پہ ظالم توڑ چکتا ہے
اُٹھاتا ہے کہیں جھنجھلا کے تب مظلوم پیشانی

اسیروں کی تڑپ بجلی گرا دیتی ہے زنداں پر
قفس کے حق میں اک شعلہ ہے طائر کی پرافشانی

مچلتا ہے گدا کے دل میں آزادی کا جب شعلہ
لرز اُٹھتا ہے پھنک جانیکے ڈر سے تاجِ سلطانی

گزر جاتی ہے جب افتادگی میں حدّ سے نخل سر سے
کہیں جب تخم کو ملتا ہے فرمانِ گل افشانی

نہ گھبرا قید و پابندی سے، پابندی تو دولت ہے
کہ بن جاتا ہے دُرِّ بے بہا اِک بوند بھر پانی

کلیدِ فتح بن جاتا ہے اِک دن قفل زنداں کا
سنا تو ہوگا تو نے بھی فسانہ ماہِ کنعاں کا

تبسم کی ہوائیں چل رہی ہیں صحنِ عالم میں — بکھرنے پر ہے شیرازہ کتابِ اشکباری کا
چمن سے آ رہی ہیں پھر صدائیں عندلیبوں کی — کلی کو چھو رہا ہے پھر نفس بادِ بہاری کا
شعاعِ حسنِ لیلیٰ موجزن ہے چشمِ مجنوں میں — ہوائے نجد نے الٹا ہے پردا پھر عماری کا
فضا میں پھر تڑپتی ہیں شعاعیں مہرِ کاوش کی — دلوں میں پھر بھڑک اٹھا ہے شعلہ بیقراری کا
برستی ہیں فلک سے کاہشیں پھر سرفروشی کی — ابلتا ہے زمیں سے ولولہ پھر جاں سپاری کا
جھپکنے ہی پہ ہے اب آنکھ عفریتِ غلامی کی — فسانہ ختم ہے اب عنبر کی خدمتگذاری کا
رکابیں تھام کر چلنے لگے تھے جو حریفوں کی — سبق دہرا رہے ہیں پھر سے مشقِ شہسواری کا
دھمک پیدا ہے پھر چھوٹی ہوئی نبضوں میں مشرق کی — کلیجہ خون ہے پھر مغربی "بیمارداری" کا
نظر ہے کلبۂ مزدور پر معمارِ فطرت کی — تلاطم میں ہے قصرِ آہنی سرمایہ داری کا

شہانِ کج کلہ پر تنگ ہے عالم کی پہنائی
درِ دہقاں پہ دستک دے رہی ہے شانِ دارائی

جہانبانی، دہکتی آگ ہے، گرتی ہوئی بجلی — ہمیشہ اس نے دنیا میں کیا دورِ محن پیدا
ہزاروں تجربوں کے بعد اب انساں یہ سمجھا ہے — کہ شاہی سے نہیں ہوتا شرافت کا چلن پیدا
نہ ہو چینِ جفا جب تک جبینِ شہریاری پر — نہیں ہوتا کلاہِ خسروی میں بانکپن پیدا
چٹانیں سر دھنیں گی سنگریزے خون رو دینگے — مگر ہوگا نہ خسرو میں گدازِ کوہکن پیدا
امید اس سے نہ رکھ نادان! مرغانِ خوش الحاں کی — ہمیشہ جس بیاباں سے ہوئے زاغ و زغن پیدا

اُسے بُوئے گُل و پیراہنِ یوسف سے کیا نسبت — ہوا کرتا ہے جس صنعت سے کافور و کفن پیدا

ترا اے حامیٔ تاج و عَلم! کیا یہ عقیدہ ہے؟ — کہ ہو سکتی ہے نافِ گرگ سے مشکِ ختن پیدا

تجھے بیگانۂ وضعِ جہاں! کیا یہ توقع ہے؟ — کہ ہونگے کلکِ دشنام سے شیریں سخن پیدا

سمجھتا ہے کہ وہ حق بات کی تلخی کو سہ لیگا؟ — خوشامد سے بھی جس ماتھے پہ ہو اکثر شکن پیدا

سُن اے غافل! کہ تا روزِ قیامت نسلِ شاہی سے — نہ ہوگا بزمِ انسانی کا صدرِ انجمن پیدا

مروّت آئیگی اُس وقت چشمِ شہریاری میں — حبش کی خاک سے جس وقت ہونگے سیم تن پیدا

ریں گے کبر سے اُس روز یہ فرعون کے وارث — سرِ یزداں میں ہوگا جب دماغِ اہرمن پیدا

ظر ڈالی نہیں تو نے کبھی آئینِ فطرت پر — کیا ہے آج تک شعلے نے برگِ یاسمن پیدا؟

ا ہے موت کے چشمے سے دریا آبِ حیواں کا؟ — ہوا ہے سینۂ شمشیر سے دُرِّ یمن پیدا؟

ال اُگتے ہوں نیزے اُس زمینِ قہرِ فطرت سے — سمجھتا ہے کہ ہونگے سرو و شمشادِ چمن پیدا

ہ آہن سے ٹپکی ہیں شرابِ ناب کی موجیں؟ — خمِ زنجیر سے ہوتی ہے زلفِ پُرشکن پیدا؟

اُٹھائے گا کہاں تک جوتیاں سرمایہ داری کی

جو غیرت ہو تو بنیادیں ہلا دے شہریاری کی

ناز ک پہ تیرے رحم آتا ہے مجھے لیکن — نہ دوں دعوت تجھے کس طرح قوت آزمانے کی

ے اے کاش شاعر کی طرح محسوس ہو سکتا — نظر پڑتی ہے تجھ پر کس حقارت سے زمانے کی

ا سے نوعِ انسانی کے حق میں طوقِ لعنت ہے — کسی ہم جنس کی چوکھٹ پہ عادت سر جھکانے کی

نہ ہو مغرور اگر مائل بہ نرمی بھی ہو سلطانی　　　کہ یہ بھی ایک صورت ہے تجھے غافل بنانے کی

گئے وہ دن کہ تو زنداں میں جب آنسو بہاتا تھا　　　ضرورت ہے قفس پر اب تجھے بجلی گرانے کی

گئے وہ دن کہ تو محرومیِ قسمت پہ روتا تھا　　　ضرورت ہے تجھے اب آفتوں پر مسکرانے کی

تڑپ، پیہم تڑپ، اتنا تڑپ، برقِ تپاں بن جا

خدارا اے زمینِ بے حقیقت! آسماں بن جا

۱۹۲۸ء

نازک اندامانِ کالج سے خطاب!

چھین لی تم نے نسائیت سے ہر شیریں ادا
مرحبا اے نازک اندامانِ کالج! مرحبا

جنگ سر پر اور یہ محبوبیت چھائی ہوئی
ناز سے نیچی نگاہیں، چال اٹھلائی ہوئی

انگلیوں میں عشوۂ ترکانہ در کھولے ہوئے
"سینٹ" کی خوشبو میں روحِ ناز پر تولے ہوئے

"خال و خد" سے جذبہائے صنفِ نازک آشکار
"کرزنی" چہروں میں "زن" بننے کے ارماں بیقرار

الحذر! یہ جنبشِ مژگاں کا شیریں ارتعاش
عزتِ آبا کا دل ہے جس کی رو میں پاش پاش

الاماں! یہ زینتیں، مونہے ہیں گو اترے ہوئے
ذوق ہے گھنگرو کا، "گیٹس" پاؤں میں پہنے ہوئے

ریشمی رومال سے ہے فرقِ نازک پر بہار
اوڑھنی پر دیدنی ہے راہ کا گرد و غبار

نازکی کا مقتضیٰ، پتلی چھڑی باندھے ہوئے
شوقِ کنگن کا کلائی پر گھڑی باندھے ہوئے

جنگ اور نازک کلائی، پیچ ہیں تقدیر کے
ٹوٹ نہ جائے گی "لنگوڑی" بوجھ سے شمشیر کے

پاؤں رکھتے ہو دمِ گل گشت کس کس ناز سے
اے میں قرباں! رن میں نکلو گے اسی انداز سے؟

دیر سے توپوں کے منہ کھولے ہوئے ہے روزگار
سینۂ گیتی ہے جس کی دھمک سے شعلہ شعار

شغلِ زینت سے تمہیں فرصت مگر ملتی نہیں
کیا تمہارے پاؤں کے نیچے زمیں ملتی نہیں؟

سُن لو جو موزوں نہیں مردانہ سیرت کیلئے
زندگی اُن کی وبا ہے آدمیت کے لئے

مرد کہتے ہیں اُسے اے مانگ چوٹی کے غلام
جس کے ہاتھوں میں ہو طوفانی عناصر کی لگام

مرد کی تخلیق ہے زور آزمانے کے لیے
گردنِ سرکش حوادث کی جھکانے کے لئے

مرد ہے سیلاب کے اندر اکڑنے کے لئے
بحر کی بپھری ہوئی موجوں سے لڑنے کیلئے

مرد کہتے ہیں اُسے اے بندگانِ طمطراق
جو جلالِ برق و باراں کا اڑاتا ہو مذاق

جنگ میں ہو بانکپن جس کی شجاعت کا گواہ
رزم کے میداں میں کج کرتا ہو ماتھے پر کلاہ

دوڑتا ہو شعلہ خُو بجلی کا دامن تھامنے
مسکراتا ہو گرجتے بادلوں کے سامنے

مضحکہ کرتا ہو خوں آشام تلواروں کے ساتھ
کھیلتی ہوں جسکی نیندیں سُرخ انگاروں کے ساتھ

تُم مگر اِس زندگی کے کھیل سے ہٹتے ہو دُور
آفریں اے عصرِ حاضر کے جوانانِ غیور!

ہے تمہارا ارتقا پروردۂ سعیٔ زوال
الاماں تعلیم کالج کا اجل پرور مآل

جیب میں کوڑی نہیں اور اِس قدر شان و شکوہ
سر جھکا لے شرم سے اے فاقہ مستوں کے گروہ

یُوں تمہارے مُنہ کے اندر ہے فرنگی کی زبان
خوف ہے گونگا نہ ہو جائے کہیں ہندوستاں

یہ لباسِ مغربی جسلدوں کو چمکاتا نہیں
تُم کو اِس بہروپئے پن سے حجاب آتا نہیں

کیا غضب ہے تم سے بُوئے ایشیا آتی نہیں سچ کہو کیا واقعی تم کو حیا آتی نہیں؟

زندگی طوفان ہے، اور ناؤ ہو تم پاپ کی
آہ جیتی جاگتی بدبختیو ماں باپ کی

یہ بھی کوئی زندگی ہے غم کی ماری زندگی نوعِ انسانی کی ذلت ہے تمہاری زندگی
یہ بھی کوئی زندگی ہے سست و غافل زندگی بے حمیت بدگہر بے روح، بزدل زندگی
یہ بھی کوئی زندگی ہے پست و ابتر زندگی فکر سے کچلی ہوئی بیمار و لاغر زندگی
یہ بھی کوئی زندگی ہے، بے نظام و بے اساس جذبۂ تقلیدِ مغرب میں زبون و بدحواس
آہ بھرتی زندگی، آنسو بہاتی زندگی بھوک کی دلدل کی تہ میں کلبلاتی زندگی
بھاگتی، بجھتی، دبکتی تھرتھراتی زندگی کانپتی، ڈرتی لرزتی کپکپاتی زندگی
جس کو اک دن بھی نہ حاصل فارغ البالی ہوئی موت کے بے رحم و سرد آغوش کی پالی ہوئی
راستہ بھولی ہوئی، بے بہیم سہمی ہوئی زندگی پیٹ کے بل رینگنے والی سسکتی زندگی

مفلسی کی یورشِ پیہم سے گھبرائی ہوئی
غیر کی روندی ہوئی، دشمن کی ٹھکرائی ہوئی

آہ، اے بیگانۂ انجام و آغازِ حیات سن کہ تا کھل جائے تیری موت پر رازِ حیات
اہلِ عالم کی نظر میں محترم ہوتا نہیں مرد جب تک صاحبِ سیف و قلم ہوتا نہیں
سیف کا دامن تو ہے اِک عمر سے چھوٹا ہوا اور قلم ہے اِک سو وہ بھی خیر سے ٹوٹا ہوا

کچھ خبر بھی ہے تجھے اے طفلکِ زار و نزار — زیست کا ہے دست و بازو کی صلابت پر مدار

غور سے سن اے نگارِ مجلسِ تہذیبِ خام — کھردرے ہاتھوں میں رہتی ہے حکومت کی لگام

بل پہ لوہے کے جو لے سکتا ہے دنیا سے خراج — جگمگاتا ہے اسی کے فرق پر سونے کا تاج

فکرِ ناقص کو تری سرمایۂ تحقیق دے — کاش دنیا مرد بننے کی تجھے توفیق دے

عزم تیرا آگ کے سانچے میں جب ڈھل جائیگا

طوقِ محکومی کا لوہا خود بخود گل جائے گا

۱۹۳۱ء

It is actually a nice book. It can guide a worker in his

Remarking very nice.

زِنداں کا گیت

لو آ گیا وہ کوئی گلستاں لئے ہوئے — چہرے پہ رنگِ صبحِ درخشاں لئے ہوئے

کلیاں ہر اِک روش پہ چٹکنے لگیں تمام — گوہر فشانیٔ لبِ خوباں لئے ہوئے

نکلا فضا پہ صُبح کا وہ نُقرئی جلوس — گُلبانگِ طائرانِ خوش الحاں لئے ہوئے

فیضِ صبا سے مقدمِ صبحِ بہار میں — ہر خار و خس ہے جُنبشِ مژگاں لئے ہوئے

یہ رنگ کیا ہے کشورِ ہندوستاں کا آج
ہر ذرۂ حقیر ہے بُستاں لئے ہوئے

یعنی ہر ایک ذرّہ ہے خونِ وفا سے سُرخ — اور سُرخیاں ہیں روضۂ رضواں لئے ہوئے

اِس موجِ خُوں سے دل میں نہ لانا کبھی ہراس — یہ موجِ خُوں ہے لعلِ بدخشاں لئے ہوئے

اِس ترکِ استبداد سے ہونا نہ بدحواس — یہ ترک ہے خروشِ فراواں لئے ہوئے

اِن عصمتوں سے اہلِ دغا کی نہ ہو اُداس — یہ عصمتیں ہیں جذبۂ عصیاں لئے ہوئے

گو ہند آج باغِ جہاں میں ہے مثلِ خس — یہ خار و خس ہے سُنبل و ریحاں لئے ہوئے

اِن جالیوں پہ حبسِ تاریک کی نہ جا — یہ جالیاں ہیں جُنبشِ مژگاں لئے ہوئے

اِن کروٹوں کو اہلِ قفس کی سُبک نہ جان — یہ کروٹیں ہیں موجۂ طوفاں لئے ہوئے

اِن ظلمتوں پہ مطلعِ اُمید کی نہ جا — یہ ظلمتیں ہیں چشمۂ حیواں لئے ہوئے

ظاہر میں بزدلی ہے یہ درماندگی مگر — یہ بزدلی ہے جنگ کا ساماں لئے ہوئے

آگاہ ہو ندیم! کہ یہ زہرِ بیرِ صبر — دل میں ہے عزمِ شعلۂ عریاں لئے ہوئے

آزادیوں کے دیکھ رہا ہے لطیف خواب — زندانیانِ عشق کو، زنداں لئے ہوئے

اے پیرِ خستہ! مژدہ کہ سنکی ہوائے مصر — بوئے قمیصِ یوسفِ کنعاں لئے ہوئے

کہہ دو صدف سے آنکھ اُٹھائے سوئے فلک — آیا ہے ابرِ قطرۂ نیساں لئے ہوئے

بلقیس سے کہو کہ سرِ بارگاہِ ناز — پریاں کھڑی ہیں تختِ سلیماں لئے ہوئے

جوشؔ اہلِ دل کے پاؤں کی زنجیر پر نہ جا
یہ سلسلہ ہے زلفِ پریشاں لئے ہوئے

۱۹۲۴ء

ہوشیار

آرہی ہے نیند تجھکو درمیانِ کارزار   دیکھ وہ تیغِ عدو چمکی خدارا ہوشیار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

خون کے دھارے کے اندر سے ہے جبکار اشتہ   آنسوؤں کے سیل میں تو ڈھونڈتا ہے وہ دیار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

آرہی ہے دستِ استبداد سے بادِ سموم   اور محکومی سمجھتی ہے نسیمِ خوشگوار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

تن سے رخصت ہو رہی ہے روحِ مزدورِ ضعیف   حلق پر رکھا ہوا ہے خنجرِ سرمایہ دار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

جانور لیں سانس یکرنگی و آزادی کیساتھ   نوعِ انساں اور تقسیمِ غلام و شہریار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

ضعف و قوت میں توازن ہو یہ ممکن ہی نہیں   پھول سے گلچیں کا ہر پیمان ہے نااستوار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

رحم کی درخواست سے پہلے یہ دل میں سوچ لے   خون ہے خادم کا آقا کے گلستاں کی بہار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

گڑگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں   آدمی کا آدمی کرتا ہے اکثر یوں شکار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

دیکھتا ہوں عصرِ حاضر کی نگاہِ مہر میں   وہ دہکتی آگ کا نہیں جس میں ہے دوزخ کے شرار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

عرصۂ عالم کا ہر ذرّہ ہے میدانِ عمل   بزمِ ہست و بود کا ہر ذرّہ ہے روزِ شمار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

سنہ ۱۹۳۰ء

ایک شہیدِ وطن کی یاد میں

اے بہادر! اے شہیدِ خنجرِ ارباب کیں — جان جو اس شان سے دیتا ہے مر سکتا نہیں

پڑ رہی ہے اس طرف گردن میں پھانسی کی گرہ — کھل رہا ہے اس طرف آغوشِ فردوسِ بریں

نوجوانو! توڑ ڈالو سبحہ و زنار کو

تا کجا یہ احمقانہ دار و گیرِ کفر و دیں؟

نوجوانو! عشق کو درکار ہے مجنوں کا دل — تا بہ کے یہ عشوہ ہائے لیلیٔ محمل نشیں؟

نوجوانو! خون جینے کے لئے تھوڑا سا خون — خون کی پیاسی ہے مدت سے وطن کی سرزمیں

پوچھے اب تم سے اگر کوئی کہ "ہیں جانیں عزیز"

یک زباں ہو کر پکار اٹھو "نہیں ہرگز نہیں"

سنہ ۱۹۳۰ء

لمحۂ آزادی

سنو اے بستگانِ زلفِ گیتی! ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے

کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر، غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

سنہ ۱۹۳۱ء

بزمِ باقی

چونک اے دل، کہ ابھی تک ہے وہ محفل باقی
وہی محمل ہے، وہی رونقِ محمل باقی

اب بھی ہر چیز ہے آئینۂ رخسارِ حبیب
اب بھی ہر شے ہے یہاں ناز کے قابل باقی

اب بھی ہر دل پہ ہے اس کاکلِ شبرنگ کا دام
اب بھی ہر روح میں ہے شورِ سلاسل باقی

آج تک کشمکشِ عشق کا محکم ہے نظام
وہی ناخن ہے، وہی عقدۂ مشکل باقی

سن کہ، اب تک ہے بیاباں میں جرس گرمِ فغاں
اٹھ کہ، اب تک ہیں محبت و اقفِ منزل باقی

ذرۂ خاک کو جو مہر بنا دیتا ہے
آج بھی تجھ میں ہے وہ جوہرِ قابل باقی

راہ کو منزلِ مقصود سمجھنے والے!
جانتا ہے ابھی کتنے ہیں مراحل باقی

غور کرنے سے الجھتا ہے ترا دل، ورنہ
اب بھی ہے کشمکشِ حلِّ مسائل باقی

دل میں جو آگ تھی، ہر چند پڑی ہے خاموش
پھر بھی اک آنچ سی ہے متصلِ دل باقی

تو نے سننے کی قسم کھائی ہے ناداں ورنہ
اب بھی گلشن میں ہے گلبانگِ عنادل باقی

تو نے کیا سوچ کے یوں میان میں رکھ لی تلوار
دیکھ اب تک ہے نزاعِ حق و باطل باقی

نبضِ ہستی کی دھمک جوش ہو کیونکر محسوس
جو دھڑکتا تھا، وہ پہلو میں نہیں دل باقی

۱۹۲۹ء

مستقبل کے غُلام

یہ ہند کے سَمَن بر، شیریں کلام بچے   یہ گُل عِذار بچے، یہ لالہ فام بچے

بے وجہ شادمانی بشّاش رہنے والے   یہ موجِ سرخوشی پر ہنس ہنس کے بہنے والے

یہ دہر کی دُعا کو تاثیر دینے والے   یہ خوابِ زندگی کی تعبیر دینے والے

رہ رہ کے یہ فلک کی جانب ہُمکنے والے   یہ شاخِ عمرِ نَو کے تازہ چہکنے والے

یہ اینڈنے، مچلنے، بڑھنے، اُبھرنے والے   یہ رنگِ تازہ نقشِ عالم میں بھرنے والے

کس شانِ دلکشی سے پھرتے ہیں شور کرتے   یہ گُنگناتے غنچے، یہ بولتے شگوفے

امواجِ زندگی پر الماس کے سفینے   شیرینیوں سے مملو، ذی رُوح آبگینے

فطرت نے دل سے چاہا ان کا لطیف ہونا   دی ماہِ نَو کی چاندی، پہلی کرن کا سونا

لیکن وطن کی حالت پیہم ڈرا رہی ہے   دل سے یہ رُوح فرسا آواز آ رہی ہے

اِک دن "ذلیل" "وحشی" اِن کے بھی نام ہونگے

اپنی ہی طرح اِک دن یہ بھی غلام ہوں گے

سنہ ۱۹۳۰ء

شریکِ زندگی سے خطاب

اے شریکِ زندگی! اس بات پر روتی ہے تو — کیوں مرا ذوقِ ادب ہے مائلِ جام و سبو

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ اہلِ خانقاہ — داڑھیوں سے ہندیوں کو کر رہے ہیں رُوسیاہ

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ مصنوعی صلوٰۃ — خم کئے دیتی ہے اپنے وزن سے پشتِ حیات

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ دشمن کا عتاب — تیری ہمجنسوں کی راہوں میں اُلٹتا ہے نقاب

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ ہے گرمِ فغاں — سبحہ و زنّار میں جکڑا ہوا ہندوستاں

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ تیرے نونہال — بن رہے ہیں مغربی تہذیب سے رنگیں جمال

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ تھے جو شہسوار — آج اُن لڑکوں میں ہے لیلیٰ و سلمیٰ کا نکھار

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ ہندی نوجواں — کھو چکا ہے صف شکن اسلاف کی رُوحِ تپاں

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ شمشیرِ وطن — بن چکی ہے بزمِ محکومی کی شمعِ انجمن

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ ملت کا شباب — شیب کی ناوقت یورش سے ہے جویائے خضاب

کس لئے اس پر نہیں روتی کہ بیٹے کی جبیں — باپ کے ماتھے کی سی تابندگی رکھتی نہیں

چھوڑ کر چہرے کے دھبے آئینہ دھوتی ہے تو
میری درویشانہ مے خواری پہ کیا روتی ہے تو!

۱۹۲۶ء

زمانہ بدلنے والا ہے

ستم شعار! یہ اندازِ ساحری کب تک؟ رہے گی گرمیِ بازارِ سامری کب تک؟

یہ درسِ امن کی ابلہ فریبیاں تا چند؟ یہ اشتہارِ کرم کی فسوں گری کب تک؟

یہ بزمِ عیش، یہ آہنگِ خسروی تا کے یہ سازِ کیف، یہ گلبانگِ قیصری کب تک؟

یہ فرِّ کنگرۂ قصرِ برتری تا چند یہ رعبِ طرّۂ دستارِ سروری کب تک؟

یہ کافرانہ نگاہِ خدا رسی تا کے یہ بزدلانہ ادائے سپہ گری کب تک؟

یہ طنطنے یہ تحکّم یہ دبدبے تا چند یہ ناوری، یہ خدائی، یہ قاہری کب تک؟

یہ شغلِ ظلم، یہ آئینِ دلدہی تا کے یہ مشقِ جور، یہ اندازِ دلبری کب تک؟

یہ چیرہ دستیِ تثلیثِ ناروا تا چند یہ فتنہ خیزیِ توحید آوری کب تک؟

یہ شیطنت میں نمودِ پیمبری تا کے پیمبری میں یہ اندازِ داوری کب تک؟

ٹھہر کہ چرخ نئی چال چلنے والا ہے
سنبھل سنبھل کہ زمانہ بدلنے والا ہے

۱۹۲۵ء

مستقبل

مژدہ اے دل! کہ نیا اب سر و ساماں ہو گا — جس کو دشوار سمجھتا ہے وہ آساں ہو گا

ایک بار اور صبا لائے گی پیغامِ وصال — ایک بار اور علاجِ غمِ ہجراں ہو گا

ایک مبہم سا نشاں ہو گا نشانِ آلام — ایک بھولا سا فسانہ غمِ دوراں ہو گا

سنگریزہ کہ سرِ خاک پڑا ہے خاموش — کاوشِ مہر سے کل لعلِ بدخشاں ہو گا

رودکشِ دشت و جبل قصرِ سلاطیں ہوں گے — ہمسرِ بامِ فلک کلبۂ دہقاں ہو گا

قدمِ فقر پہ جھک جائے گی شاہی کی جبیں — دستِ افلاس میں دولت کا گریباں ہو گا

خوفِ صیاد سے جو بھول چکا ہے پرواز — کل وہی مرغِ قفس مرغِ سلیماں ہو گا

پک رہا ہے جو بیاباں کی کڑی دھوپ میں آج — کل اسی سر کے لئے تاجِ گل افشاں ہو گا

آج جو دوب کا اک ریشہ ہے اور کچھ بھی نہیں — کل وہ تلوار کی صورت میں نمایاں ہو گا

آج جس بزم پہ طاری ہے جلالِ فرعون — کل وہیں دبدبۂ موسیٰ عمراں ہو گا

آج جس رعب سے ہے روئے امارت پہ شکوہ — کل وہ مزدور کے چہرے سے نمایاں ہو گا

حکمِ ساقی سے ہے جو حلقۂ بیرونِ در آج — کل وہی بزم میں رقصانِ غزلخواں ہو گا

نفسِ بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد
عالمِ پیر دگر بار جواں خواہد شد

(حافظ)

۱۹۲۹ء

اللہ کرے

اللہ کرے اے ہند! اس فتنۂ دوراں میں — ہو گوئے ظفر مندی تیرے خمِ چوگاں میں

کانٹوں کو بناتی ہے جو بادِ صبا گلشن — آئے وہ صبا تیرے اُجڑے ہوئے بستاں میں

دل ملتے ہیں جس مے سے معبود وہ مے ٹپکا — پیمانۂ ہندو میں مینائے مُسلماں میں

راتوں کو چٹکتے ہیں سینے میں جو شاعر کے — وہ عُقدہ کُشا غنچے مہکیں ترے داماں میں

اوراق سے اُڑ جائیں اغیار کی تحریریں — اب مُہر تری جھلکے ہر دفتر و دیواں میں

ہاں نُوح کی کشتی کی تقدیر ملے تجھ کو — اِس بحرِ سیاست کے بپھرے ہوئے طوفاں میں

اے طاقِ وطن! تجھ میں اے کاش پر افشاں ہو — وہ نور کہ غلطاں تھا قندیلِ سلیماں میں

اے کاش کبھی تیری ظلمت کی طرف دیکھے — وہ شمع کہ روشن ہے عشرت گہِ یزداں میں

ساقی کے تبسّم سے اور جوش کے بربط سے
روشن ہوں کنول تیری محرابِ زر افشاں میں

سنہ ۱۹۳۰ء

وطن [۱]

اے وطن، پاک وطن، اے روحِ روانِ احرار   اے کہ ذرّوں میں ترے بوئے چمن، رنگِ بہار

اے کہ خوابیدہ تری خاک میں شاہانہ وقار   اے کہ ہر خار ترا روکشِ صد روئے نگار

ریزے الماس کے تیرے خس و خاشاک میں ہیں

ہڈیاں اپنے بزرگوں کی تری خاک میں ہیں

پائی غنچوں میں ترے، رنگ کی دنیا ہم نے   تیرے کانٹوں سے لیا درسِ تمنّا ہم نے

تیرے قطروں سے سنی قرأتِ دریا ہم نے   تیرے ذرّوں میں پڑھی آیتِ صحرا ہم نے

کیا بتائیں کہ تری بزم میں کیا کیا دیکھا

ایک آئینے میں دنیا کا تماشا دیکھا

تیری ہی گردنِ رنگیں میں ہیں باہیں اپنی   تیرے ہی عشق میں ہیں صبح کی آہیں اپنی

۱۔ میں تمام نوعِ انسانی کو ایک خاندان سمجھتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں، وطنیّت کے اُس ناپاک تخیّل کو جو خود غرضی، تنگ نظری، منافرت اور ابنِ آدم کی تقسیم چاہتا ہے انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں لیکن اِس قدر وطنیّت میرا ایمان ہے کہ اپنے گھر کو غاصبوں کے تسلّط سے محفوظ رکھا جائے ۔ (مصنّف)

تیرے ہی حسن سے روشن ہیں نگاہیں اپنی   کج ہوئیں تیری ہی محفل میں کُلاہیں اپنی

بانکپن سیکھ لیا عشق کی افتادوں سے

دل لگایا بھی تو تیرے ہی پری زادوں سے

پہلے جس چیز کو دیکھا، وہ فضا تیری تھی   پہلے جو کان میں آئی، وہ صدا تیری تھی

پالنا جس نے ہلایا، وہ ہوا تیری تھی   جس نے گہوارے میں چوما، وہ صبا تیری تھی

اوّلیں رقص ہُوا مست گھٹائیں تیری

بھیگی ہیں اپنی مسیں آب و ہوائیں تیری

اے وطن! آج سے کیا ہم ترے شیدائی ہیں   آنکھ جس دن سے کھلی تیرے تمنائی ہیں

مدّتوں سے ترے جلووں کے تماشائی ہیں   ہم تو بچپن سے ترے عاشق و سودائی ہیں

بھائی طفلی سے ہر اک آن جہاں میں تیری

بات تتلا کے جو کی بھی تو زباں میں تیری

حُسن تیرے ہی مناظر نے دکھایا ہم کو   تیری ہی صُبح کے نغموں نے جگایا ہم کو

تیرے ہی ابر نے جھُولوں میں جھُلایا ہم کو   تیرے ہی پھُولوں نے نوشاہ بنایا ہم کو

خندۂ گُل کی خبر تیری زبانی آئی

تیرے باغوں میں ہوا کھا کے جوانی آئی

تجھ سے منہ موڑ کے مُنھ اپنا دکھائینگے کہاں؟   گھر جو چھوڑینگے تو پھر چھاؤنی چھائینگے کہاں؟

بزمِ اغیار میں آرام یہ پائینگے کہاں؟ تجھ سے ہم رُوٹھ کے جائیں بھی تو جائینگے کہاں؟

تیرے ہاتھوں میں ہے قسمت کا نوشتہ اپنا
کس قدر تجھ سے بھی مضبوط ہے رشتہ اپنا

اے وطن ! جوش ہے پھر قوّتِ ایمانی میں خوف کیا دل کو سفینہ ہے جو طغیانی میں
دل سے مصروف ہیں ہر طرح کی قربانی میں محو ہیں جو تری کشتی کی نگہبانی میں

غرق کرنے کو جو کہتے ہیں زمانے والے
مسکراتے ہیں تری ناؤ چلانے والے

ہم زمیں کو تری ناپاک نہ ہونے دینگے تیرے دامن کو کبھی چاک نہ ہونے دینگے
تجھ کو جیتے ہیں تو غمناک نہ ہونے دینگے ایسی اکسیر کو یوں خاک نہ ہونے دینگے

جی میں ٹھانی ہے یہی جی سے گزر جائیں گے
کم سے کم وعدہ یہ کرتے ہیں کہ مر جائیں گے

۱۹۱۸ء

شکستِ زنداں کا خواب

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اُکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں

کیا اُنکو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو رُوحِ ملت کو
اُبلینگے زمیں سے مار سیہ برسینگی فلک سے شمشیریں

کیا اُنکو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بیرنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں

کیا اُن کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اِسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں

سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اُٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں

سنہ ۱۹۲۱ء

علی گڑھ کالج کی پنجاہ سالہ جوبلی

یہ نہ پوچھو کہ ہم نے کیا دیکھا — جوبلی میں وہ ماجرا دیکھا

قوم سے جس نے کر دیا بیزار — بن گئے ہم زِ نقش بر دیوار

اتنے بہروپیے نظر آئے — اپنی آنکھوں میں اشک بھر آئے

پوششیں مغربی اماموں کی — صورتیں مشرقی غلاموں کی

پینٹ میں ہاتھ اور منہ میں سگار — شانے ہلتے ہوئے دمِ گفتار

طاقِ دل میں چراغِ انگریزی — سر کے اندر دماغ انگریزی

چال انگریزی ڈھال انگریزی — جسم کا بال بال انگریزی

جسمِ ہندی میں جان انگریزی — منہ کے اندر زبان انگریزی

گفتگو میں بنی ہوئی آواز — خمِ گردن میں مغربی انداز

اپنے لہجوں سے ہاتا پائی تھی — حلق کی ساخت سے لڑائی تھی

چھل رہا ہے گلا تو چھل جائے — لہجہ "صاحب" سے اپنا مل جائے

جوشِ پنجاہ سالہ جوبلی کا — آپ سمجھے کہ مدعا کیا تھا؟

یہ جتانا تھا، دیکھو بڑھ گئے ہم — سوئے نصرانیت پچاس قدم!

آنچ کم، ہر طرف دھواں ہی دھواں
وائے بر سعیِ سید احمد خاں

سنہ ۱۹ء

علیگڑھ سے خطاب

اے علی گڑھ، اے جوانِ قسمتِ بستانِ کہن — اے کہ شمعِ فکر سے تابندہ تیری انجمن

تیرے پیمانوں میں لرزاں ہے شرابِ علم و فن — حشر کے دن تک پھلا پھولا رہے تیرا چمن

مشعلِ مینا سے روشن تیرا میخانہ رہے

رہتی دنیا تک ترا گردش میں پیمانہ رہے

ایک دن ہم بھی تری آنکھوں کے بیماروں میں تھے — تیری جنسِ علم پرور کے خریداروں میں تھے

تیری زلفِ خم بخم کے گرفتاروں میں تھے — تیرے اصنامِ سمن بر کے پرستاروں میں تھے

تیری برقِ جلوۂ رنگیں پہ شیدا ہم بھی تھے

تیرے کوہِ طور کے اک روز موسیٰ ہم بھی تھے

لیکن اے علم و معارف کے درخشاں آفتاب — کچھ بہ اندازِ دگر بھی تجھ سے کرنا ہے خطاب

گو یہ دھڑکا ہے کہ ہوگا موردِ قہر و عتاب — کہہ ہی دوں جو کچھ ہے دل میں تا کجا یہ پیچ و تاب

بن پڑے جو سعی اپنے سے وہ کرنا چاہیے

مرد کو کہنے کے موقع پر نہ ڈرنا چاہیے

اے علی گڑھ، اے ہلاکِ جلوۂ وضعِ فرنگ — "ٹیمز" ہے آغوش میں تیرے بجائے موجِ گنگ

ظلمتِ مغرب میں ہے آوارہ تیری ہر امنگ — ولولوں پہ تیرے شاید عرصۂ مشرق ہے تنگ

آکہ حیراں ہے وطن کا کارواں تیرے لئے

گوش بر آواز ہے ہندوستاں تیرے لئے

عاشقِ مغرب! نگاہِ شرق کے جادو بھی دیکھ ۔۔۔ اے سنہری زلف کے قیدی! سیہ گیسو بھی دیکھ

دیدۂ ازرق کے شیدا! دیدۂ آہو بھی دیکھ ۔۔۔ سازِ بے رنگی کے بندے! سوزِ رنگ و بو بھی دیکھ

"جمنا" کے "موج" لرزاں کے شرارے کو بھی دیکھ

"ٹیمز" سے منہ موڑ کر گنگا کے دھارے کو بھی دیکھ

پختہ کاری سیکھ، یہ آئینِ خامی تا کجا ۔۔۔ جادۂ افرنگ پر یہ تند گامی تا کجا

سوچ تو جی میں یہ جھوٹی نیک نامی تا کجا ۔۔۔ مغربی تہذیب کا طوقِ غلامی تا کجا

مرد اگر ہے غیر کی تقلید کرنا چھوڑ دے

چھوڑ دے للہ! بالاقساط مرنا چھوڑ دے

سنہ ۱۹۲۵ء

مقتلِ کان پور[۱]

اے سیہ رُو، بے حیا، وحشی، کمینے، بدگماں
اے جبینِ ارض کے داغ، اے دَنیِ ہندوستاں

تجھ پہ لعنت اے فرنگی کے غلامِ بے شعور
یہ فضائے صلح پرور، یہ قتالِ کان پور!

تجھ کو "عورت" نے جنا ہے؟ جھوٹ ہے یہ اے لعیں
آدمی کی نسل سے اور تُو! نہیں، ہرگز نہیں

تیری جانب اُٹھ رہی ہے دیکھ دوزخ کی نگاہ
سبحہ و زنار میں جکڑے ہوئے دیوِ سیاہ!

رودِ گنگا سے لیے اِس طرح طوفانِ ممات
کس کو کھا کر آ رہا ہے او وبائے کائنات

اے درندے! یہ ترا جبڑا ہے کیوں سمٹا ہوا؟
کس کا یہ گودا ترے ناخنوں میں ہے چپکا ہوا؟

تیغِ بُراں اور عورت کا گلا، کیوں بدصفات
چھوٹ جائیں تیری نبضیں، ٹوٹ جائیں تیرے ہات

کہنیوں سے یہ تری کیسا ٹپکتا ہے لہو؟
یہ تو ہے اے سنگدل! بچوں کا خونِ مشک بو

مرد ہے تو اُس سے لڑ، پہلے جو مارے پھر مرے
تُو نے بچوں کو چبا ڈالا، خدا غارت کرے

تُو نے او بزدل! لگائی ہے گھروں میں جن سے آگ
کیا اُنہیں ہاتھوں میں لیگا رخشِ آزادی کی باگ؟

دل میں کھوٹا پن، ارادوں میں بدی، نیت خراب
او سیہ باطن! یہ عالم اور آزادی کا خواب

سُن کہ کم ظرفوں کو دے سکتی نہیں دُنیا خراج
یہ ترا چھوٹا سا سر اور رنگِ ہستی، اور تاج

۱۔ ۱۹۳۱ء کا وہ ہنگامہ جس میں خیال تھا کہ فریقین کے ۷۰۰ افراد ہلاک ہوئے۔

اس طرح انساں، اور شدّت کرے انساں پہ — تُف ہے تیرے دین پہ، لعنت ترے ایماں پہ
تو ابھرتے ہی زمانے کی نظر سے گر گیا — یوں بہایا خوں، امیدوں پہ پانی پھر گیا

رُکنے ہی والا ہے آزادی کا جاں پرور جہاد
اے فرنگی! شاد ماں باش و غلامی! زندہ باد

سنہ ۱۹۳۱ء

کب تک

رہے گی اہلِ جفا پر تری عطا کب تک — بنے رہیں گے الٰہی! یہ بُت خدا کب تک
لئے رہے گا دکھانے کو منہ میں گلدستے — زبانِ شعارِ حکومت کا اژدہا کب تک
کمندِ مکر میں اُلجھا کے پھنسنے والوں کو — زبانِ عِلم رہے گی گرہ کُشا کب تک
کوئی بتاؤ یہ پیرانِ دامن آلودہ — بنے رہیں گے جوانانِ پارسا کب تک

کوئی بتاؤ کہ قبضے میں بادِ صرصر کے
رہے گا منصبِ دیرینۂ صبا کب تک

سنہ ۱۹۳۱ء

غدّار سے خطابؓ

ہوشیار اے بے حیا غدّار! اے نقشِ دُوئی
دیکھ! آپہنچا وہ اے بدبخت! وقتِ جانکنی

وقتِ انتقام ہے، بیدار ہو اے بدنصیب
وہ اجل کا سرد چنگل آگیا سر کے قریب

لے وطن کی تیغ وہ نکلی، حکومت کو پکار
ساتھیوں کو دے صدا، دیوِ رذالت کو پکار

خون میں اپنے ہی تجھ کو دیکھ کر لتھڑا ہوا
گونجتی ہی پر ہے خونی قہقہہ شیطان کا

قبر تیری ٹھوکریں کھاتی رہے گی حشر تک
پھول اپنے روک لیگی نرم شاخوں کی لچک

رخ نہ تیری جانبِ گردوں کریگی جب سفر
بادلوں سے بجلیاں جھپٹیں گی تجھ کو دیکھ کر

تو پکارے گا کوئی حاکم مجھے آکر بچائے
رعد گرجے گا کہ اب یہ بے حیا بچ کر نہ جائے

آسماں پر بھی نہ او بدبخت! پائیگا اماں
چاٹ لینے کو تجھے دوزخ نکالیگا زباں

انگلیاں اُٹھیں گی دُنیا میں تری اولاد پر
غلغلہ ہوگا، وہ آتے ہیں رذالت کے پسر

تیری مستورات کا بازار میں ہوگا قیام
معرضِ دشنام میں تیرا لیا جائے گا نام

اُس طرف مُنہ کر کے تھوکے گا نہ کوئی نوجواں
"بَر" کی حسرت میں رہینگی تیرے گھر کی لڑکیاں

کیا جوانوں کے غضب کا ذکر! او ابنِ خطاب!
سُن کے تیرا نام اُجڑ جائیگا بوڑھوں کا خضاب

فحش سمجھی جائیگی محلوں میں تیری داستاں
کانپ اُٹھینگی ذکر سے تیرے کنواری لڑکیاں

آئے گا تاریخ کا جس وقت جنبش میں قلم — قبر تیری دے اٹھے گی لو، جہنم کی قسم
صفحۂ تاریخ پر کانپیں گے یوں تیرے نشاں — بن میں جیسے رات کو ابلیس کی پرچھائیاں
تاج سے تیری وفاداری کی قسمیں بار بار — جھنجھناتی ہیں ترے ہونٹوں کے گرد اے نیزہ کار
دم گھٹا جاتا ہے میرا، دور ہو اے تیرہ دل — تیرے منہ سے جھوٹ کے آتے ہیں بھبکے متصل
تجھ سے رو گرداں نہیں ہیں صرف ملت کے زعیم — حاکمانِ وقت بھی تجھ کو سمجھتے ہیں لئیم
تجھ سے نفرت کی کھٹک دونوں کی آب و گل میں ہے — فرق یہ ہے انکے لب پر، اور انکے دل میں ہے
بزدلی ڈالے ہوئے تاریک چہرے پر نقاب — دیر سے تیرے خمِ ابرو میں ہے گرمِ خطاب
تیری پلکوں سے شقاوت کا وصال ہے آشکار — اس ٹھوڑی کے سائے میں ہے حُبِّ ملت کا مزار
بزدلی سے رخ پہ بکھرائے ہوئے سازش لٹیں — تیرے ماتھے کی شکن میں لے رہی ہے کروٹیں
تیری چشمِ تنگ کی گردش میں اے ننگِ وطن! — سو رہا ہے دردِ قومی دیر سے اوڑھے کفن
قوم کا دل ہے ترے ہونٹوں کے اندر پاش پاش — دوش پر ہے تیرے لہجے کے، تری غیرت کی لاش۔

ہو چکے ہیں مشورے تیری فنا کے واسطے
جاگ اٹھ، اب بھی سویرا ہے خدا کے واسطے

سنہ ۱۹۳۰ء

خریدار تو بن

اے دل آزادئ کامل کا سزاوار تو بن
پہلے اُس کاکُلِ پیچاں کا گرفتار تو بن

یُوں تو صبحِ رُخِ محبوب نہ ہوگی طالع
پہلے اے دیدۂ دل! دیدۂ بیدار تو بن

چشم بر راہ ہے شیرینئ صد آبِ حیات
تلخیاں جھیل کے شادابِ لبِ یار تو بن

اوّلیں شرط ہے ہر جنگ میں احساسِ خودی
فتح خود پاؤں پہ جھک جائیگی خوددار تو بن

یُوں بھڑکنے سے رہا شعلۂ عزمِ منصور
پہلے پروانۂ شمعِ رسن و دار تو بن

خود ہی چھٹ جائیگا گردوں سے ترے ابرِ خمار
ہم نشیں! خلوتئ ساقئ سرشار تو بن

قبضۂ یار میں رہنے کو اگر ہے بے چین
عرصۂ دہر میں چلتی ہوئی تلوار تو بن

آشیاں خود سے بنا دے گی مشیّت تیرا
کھیل تو آگ سے، بجلی کا خریدار تو بن

۱۹۳۱ء

خریدار نہ بن

چونک بھی خواب سے اے صیدِ زبونِ اغراض
عصرِ بیتاب میں یوں نقشِ بدیوار نہ بن

عشق میں گو دلِ بیمار ہے سب کچھ لیکن
نرگسِ ازرقِ چالاک کا بیمار نہ بن

بہرِ خوشنودیِ اغیار یگانوں کو نہ چھیڑ
اپنے ہی سر پہ جو چلتی ہے وہ تلوار نہ بن

متحد عزم سے کر سدِّ سکندر تعمیر
باہمی جنگ سے گرتی ہوئی دیوار نہ بن

چٹکیاں باغ میں سرگرم ہیں گلچینوں کی
چمنستانِ جہاں میں گلِ بے خار نہ بن

توڑ اُس جال کو جکڑے ہے جو بازو تیرے
بستۂ کشمکشِ سبحہ و زنّار نہ بن

اہلِ بازار و دنائت سے سروکار نہ رکھ
حامیِ مسئلۂ اندک و بسیار نہ بن

پست سے پست ہو جو چیز، وہ بن جا لیکن
مر کے بھی جنسِ غلامی کا خریدار نہ بن

۱۹۳۲ء

ہمّت

وہ خسروانِ ایراں نوشیروانِ کسرےٰ　　　نقشِ قدم تھے جن کے ایرانیوں کے معبد

گردوں پہ موجزن تھا جن کا بلند پرچم　　　تاروں پہ خندہ زن تھے جن کے نقوشِ مسند

سورج پہ طعنہ زن تھے جنکی گلی کے ذرّے　　　کرسی سے تھے صف آرا جن کے قصور و گنبد

شاہِ رضا نے پایا مسند پہ اُن کی قبضہ　　　شاہِ رضا کہ جس کے گمنام ہیں اب و جد

"بہ تختِ جم کہ تاجش محرابِ آفتاب است

ہمّت نگر کہ مورے با آں حقارت آمد" (حافظ)

زندہ مُردے

کیا کہوں اہلِ ہند کی حالت　　　ایک عالم ہے "دن" اگر تو یہ "رات"

خواہ کچھ ہو اثر نہیں لیتے　　　اس طرح مِٹ چکے ہیں احساسات

یا تو یہ "سائے" ہیں "بہ شکلِ بشر"

یا یہ "مُردے" ہیں کچھ "بہ قیدِ حیات"

۱۹۲۸ء

دامِ فریب[1]

سحر ہوتے ہی مخمورِ شبانہ — کہا یوں چشمِ ساقی نے فسانہ

کہ اے زندانیِ دیر و حرم! چونک — زمیں سے تا فلک ہے آستانہ

تجھے رسموں سے ہو کیا رستگاری — ترا ایمان تو ہے کافرانہ

ترا صیدِ زبونِ بزمِ ہستی! — ورائے لامکاں ہے آشیانہ

تجھے قطرے کا ہے اپنے یہ دھوکا — تو اک دریا ہے ناپیداکرانہ

کہاں تک یہ سکوتِ بے نوائی؟ — کہاں تک یہ جمودِ عامیانہ

تجھے ہے موت کا ڈر، موت کیا ہے — حقیقی زندگانی کا بہانہ

ہمیشہ سے ہے زد میں بجلیوں کی — شکستہ خاطری کا آشیانہ

کہیں بہتر ہے دھوپ سے ناداں! ابد تر — غلامی کی گھٹا کا شامیانہ

جہاں میں کچھ نہ رہ جائے گا باقی — مگر ہاں ایک مردوں کا فسانہ

جگانا ہے اگر سینے میں دل کو — تو بن تیرِ حوادث کا نشانہ

لگی ہے گھات میں مدت سے تیری — فرنگی کی نگاہِ جادوانہ

---

[1] سائمن کمیشن کے موقع پر یہ نظم کہی گئی تھی۔

عدو تیری گرفتاری کی خاطر مہیا کر رہا ہے آب و دانہ
اگر جینا ہے آزادی سے تجھکو سُنا دشمن کو بڑھ کر یہ ترانہ

"برو ایں دام بر مُرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ" (حافظؔ)

رُعبِ حُکومت

اک فرنگی معمّر و بیمار سانس لینا بھی تھا جسے دشوار
بید کو ٹیکتا چُرٹ سلگائے اک طرف جا رہا تھا سر کو جھکائے
سامنے سے مثالِ پیلِ دماں ہند کا آ رہا تھا ایک جواں
رشکِ ارجن، نمونۂ سہراب رُخ پر امواجِ عنفوانِ شباب
دونوں آئے قریب جیسے ہی ہٹ گیا ڈر کے اک طرف ہندی

خُون رو، خُون، اے دلِ محرُوم
دیکھ لے فرقِ حاکم و محکوم

۱۹۲۶ء

ناخُدا کہاں ہے؟

خبر لو آسودگانِ ساحل! کہ سامنے مرگِ ناگہاں ہے
چھڑی ہوئی دیر سے لڑائی زبوں عناصر کے درمیاں ہے

تمام دُنیا غرق غرق ہے، تمام ہستی رواں دواں ہے
حقیر تنکے کی طرح کشتی کبھی یہاں ہے کبھی وہاں ہے
کوئی خُدا کے لئے بتاؤ کہ ناخُدا کون ہے کہاں ہے؟

غضب کے گرداب پڑ رہے ہیں، عظیم طوفان زور پر ہے
بلا کی پُروائی چل رہی ہے، جلال میں رُوحِ بحر و بر ہے
تھپیڑے کھاتا ہوا سفینہ کبھی اِدھر ہے کبھی اُدھر ہے
ہوا اُٹھائے ہوئے ہے طُوفاں گھٹا نکالے ہوئے زباں ہے
کوئی خُدا کے لئے بتاؤ کہ ناخُدا کون ہے کہاں ہے؟

ہواؤں کی سنسناہٹیں ہیں سیاہ موجوں کے ہیں تھپیڑے
ہر اِک بھنور میں ہے وہ تلاطم کہ غرق کر دے ہزار بیڑے
بلا ہیں سیلاب کے طمانچے غضب ہیں طوفان کے تھپیڑے

کڑک کی زیرِ نگیں زمیں ہے گرج کے قبضے میں آسماں ہے
کوئی خدا کے لیئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے؟

بھرا ہوا غیظ میں سمندر فضا کی جانب ہمک رہا ہے
گرج اکڑک ہے کڑک چمک ہے چمک ہوا ہے، ہوا گھٹا ہے
جھنن جھنن ہے گھڑ گھڑ ہے، گھنن گھنن ہے دنا دنا ہے
فلک کے ہونٹوں پہ الحذر ہے، زمیں کے لب پر الاماں ہے
کوئی خدا کے لیئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے؟

ڈراؤنی رات رو رہی ہے بکھرے ہوئے ہیں تمام جل تھل
بھنور نکالے ہوئے ہیں آنکھیں جھکے ہوئے ہیں سیاہ بادل
ہوا میں شورش گھٹا میں غوغا فضا میں لرزش زمیں پہ ہلچل
تمام کشتی ہے پارہ پارہ، تمام گردوں دھواں دھواں ہے
کوئی خدا کے لیئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے؟

سلام لو اے عزیز یارو! کہ اب نہیں شکلِ زندگانی
کہا سنا سب معاف کردو، بھلا دو باتیں نئی پرانی
بڑھ کر وہ جھک چلا سفینہ، اُٹھ کر آنے لگا وہ پانی
مبارک اے جنگِ کفر و ایماں! حیات دم بھر کی میہماں ہے
کوئی خدا کے لیئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے؟ ۱۹۲۵ء

ضعیفہ

اِک ضعیفہ راستے میں سو رہی ہے خاک پر
مُردنی چھائی ہوئی ہے چہرۂ غمناک پر

اور کس موسم میں جب طاعون ہے پھیلا ہوا
ذرّہ ذرّہ ہے وبا کے خوف سے سہما ہوا

رات آدھی آچکی ہے، بام و در خاموش ہیں
اہلِ دولت لیلیٔ عشرت سے ہم آغوش ہیں

اِس قیامت کی ہے طاری ظلمت ہول آفریں
شب کے دل میں صبح کا گویا تصور تک نہیں

پیچھے پیچھے آ رہا ہے کون؟ یہ کیا بات ہے؟
بج رہے ہیں کان اُف کیسی بھیانک رات ہے

حلقۂ ظلمت میں ہے راہوں کی سہمی روشنی
یا چمکتی ہیں گھنی جھاڑی سے آنکھیں شیر کی

لرزہ براندام ہے صحنِ زمیں کا عرض و طول
ہو رہا ہے خاک پر ناپاک رُوحوں کا نزول

آ رہی ہیں آسماں سے یہ صدائیں دمبدم
دیکھ اسبابِ ہلاکت پر نہ پڑ جائے قدم

بام و در پر موت کا پرچم ہے لہرایا ہوا
آ رہی ہے ہر قدم پر بوئے انفاسِ وبا

رونگٹے سارے کھڑے ہیں سانس لینا ہے وبال
الاماں شورِ سگانِ راہ و غوغائے شغال

اُف لرزتی خوفناک آواز چوکیدار کی
نبض چھوٹی جا رہی ہے گنبدِ دوّار کی

چپکے چپکے سانس لینے سے گھٹا جاتا ہے دم
رکھ رہا ہوں لوٹتے ذرّوں پہ رُک رُک کر قدم

عبرت و وحشت کا خنجر ہے دلِ غمناک پر
ہائے یہ بیدم پڑا ہے کون ٹھنڈی خاک پر

آہ اے بیکس ضعیفہ! غم کی تڑپائی ہوئی — اے زمانے کی جھنجوڑی، ازل کی ٹھکرائی ہوئی

میرے دل کے آئینے کو کر رہا ہے چور چور — تیرے سر پہ رہگزر کی شمع کا ہلکا سا نور

یہ ترے سر کی سفیدی، اور یہ گرد ملال — میں تو کیا، شرما رہا ہے خود خدائے ذوالجلال

بھوک کے لشکر کا ہے رخ پر ترے گرد و غبار — عہد رزاقی کے ماتھے پر عرق ہے آشکار

تیرے بچے تیرے گردوں کے ستارے کیا ہوئے؟ — اے ضعیفہ! تیری پیری کے سہارے کیا ہوئے؟

آہ اے دکھیا! یہ کیسی پائمالی ہو گئی — ٹھوکریں کھانے کو تیری گود خالی ہو گئی

سو رہا ہے تیرا وارث کس طرف پہنے کفن؟ — دفن ہے کس دیس میں تیرا عروسی بانکپن؟

بزم عشرت میں دلھن کس نے بنایا تھا تجھے؟ — بیاہ کر کون اپنے گھر میں آہ لایا تھا تجھے؟

خون رخ پر دوڑتا ہوگا تری آواز سے — تجھ کو پالا ہوگا تیری ماں نے کس کس ناز سے

ڈالتی ہوگی تجھے نہلا دھلا کر سر میں تیل — باپ کا دل کھینچتا ہوگا تری گڑیوں کا کھیل

یاس کی تاثیر کیوں چہرے پہ دونی ہو گئی — مائیکا ویراں ہوا، سسرال سونی ہو گئی

چاہنے والے ترے سب تربتوں میں سو گئے — کھیلتی تھی جن کے گھٹنے باغوں میں وہ کیا ہو گئے

اف ری مایوسی کسی کا آسرا رکھتی نہیں — شبہ ہوتا ہے کہ تو شاید خدا رکھتی نہیں

تو کہاں کی رہنے والی ہے، ترا کیا نام ہے
بول، تو کس دل نشیں آغاز کا انجام ہے

ہند میں انسانیت کا درد ہی باقی نہیں درد ہو کس طرح، کوئی مرد ہی باقی نہیں

مرد ہی ہوتے تو کرتے بے کسوں کا احترام مرد ہی ہوتے تو رہ سکتے تھے یوں بنکر غلام؟

خدمتِ اغیار سے فرصت کوئی پاتا نہیں

سچ ہے اپنوں پر غلاموں کو ترس آتا نہیں

اے ضعیفہ ننگ ہے تو ملک و ملت کے لئے تو ہے اک دھبا جبینِ اہلِ دولت کے لئے

اک کھلی ذلت ہے اربابِ ذلل کے واسطے طوق ہے لعنت کا تو اہلِ دول کے لئے

تو وعیدِ قہر ہے اربابِ عشرت کے لئے برص کا اک داغ ہے تو ہے حکومت کیلئے

مجھ کو حیرت ہے کہ تجھ کو دیکھ کر زار و نزار گڑ نہیں جاتے حیا سے حاکمانِ ذی وقار

دیکھ کر تیرا ڈھلا منہ کا نہیں ہوتا ہے چور گردنوں کے خم کو سختی بخشنے والا غرور

پڑ نہیں جاتے الٰہی سینۂ دولت میں داغ بجھ نہیں جاتے شبستانِ امارت کے چراغ

اپنی تابِ زر سے اے سرمایہ دارو ہوشیار

اپنے تاجوں کی چمک سے تاجدارو ہوشیار

نیلم و یاقوت سے شعلے بھڑک اٹھنے کو ہیں سرخ دینار و نگیں انگارے بنکے اٹھنے کو ہیں

فرشِ گل والو! زمیں پر لوگ محوِ خواب ہیں

خرمنوں کے پاسبانو! بجلیاں بیتاب ہیں!!

۱۹۲۸ء

بوالعجبی

کل مُنہ اندھیرے صبح کو تالاب کے قریب — یاد آ رہا تھا دل کو خمِ کاکُلِ حبیب

مس ہو رہی تھی قلب و جگر سے خنک نسیم — بوجھل سی تھی ترائی کی بھیگی ہوئی شمیم

جھونکے تھے اضطراب کا پہلو لیے ہوئے — مرطوب و نرم دُوب کی خوشبو لیے ہوئے

تھی مد و جزرِ آب کے اندر چھڑی ہوئی — ٹھنڈی ہوا کے تند تھپیڑوں کی راگنی

افسانہ کہہ رہا ہے شبِ تار بجسد کا — نظروں سے اُس طرف کا کنارا چھپا ہوا

دُھندلی بلندیوں پہ گھٹاؤں کا تھا دھواں — گردوں سے آ رہی تھیں دبے پاؤں بوندیاں

چھایا ہوا تھا صبح کے ماتھے پہ رنگِ شام
اتنے میں اِک کسان نے جُھک کر کیا سلام

جاگے ہوئے لطیف خیالات سو گئے — کانپی نگاہ، رونگٹے سب جھن سے ہو گئے

مزدور، اور خُفتہ دلوں کو کرے سلام! — شاہ اور گدائے راہ نشیں کو کہے امام!!

قوت کا، اور ضُعف کے در پر سرِ نیاز — صحت اُٹھائے اونگھتی بیماریوں کے ناز

اونچی زمیں کے سامنے چرخِ بریں جُھکے — فاقے کے آستاں پہ غذا کی جبیں جُھکے

بیچارگی کے ساتھ جھکائے کریم سر — مغرور بھیک مانگنے والوں کو دیکھ کر

پودوں کے ڈر سے مالکِ گلشن ہو متغیر
پھولوں کو اور سجدے کرے خالقِ بہار

دھکے کھائے شاہ، گدائے حقیر کا
فولاد اور مان لے لوہا حریر کا

عقلِ سیاہ کار کی عزت کرے جنوں
قدموں پہ بزدلی کے ہو تلوار سرنگوں

ناطاقتی ہو کشورِ طاقت میں شہریار
ریشے کو اور برق بنائے سپاہ دار

مردانِ کوہ و دشت و دلیرانِ تند خو
عاجز ہوں دخترانِ تمدن کے روبرو

بارِ خدا! "یقین" ہو قربان "گمان" پہ
لعنت ہو اِس زمین پہ، تُف آسمان پہ

سنہ ۱۹۳۱ء

خان بہادر اور شمس العلماء

پڑھ رہی ہے "بہادری" جتنی
جُبن کی دھوپ چڑھتی جاتی ہے

جس قدر "شمس" ہو رہے ہیں طلوع
تیرگی اور بڑھتی جاتی ہے

سنہ ۱۹۳۰ء

پیرزن

اک مشن اسکول کی لیڈی بصد انداز و ناز	دختران ہند سے ہے دیکھو سرگرم نیاز

پھر رہی ہے لڑکیوں کی صف میں بل کھاتی ہوئی	ہاتھ میں کنگھی لیے زلفوں کو سلجھاتی ہوئی

کچھ خبر بھی ہے تجھے ناواقفِ لیل و نہار	یعنی اس تزئینِ گیسو میں ہے کتنا خلفشار

کنگھیاں کی جا رہی ہیں کاکلِ شبگیر میں	پیچ ڈالے جا رہے ہیں ہند کی تقدیر میں

واں سلجھتے جا رہے ہیں گیسوئے عنبر شکن	یاں الجھتا جا رہا ہے عقدۂ اہلِ وطن

کام سے جس وقت یہ مشاطہ فرصت پائیگی	ہندیوں کے ہر بنِ مو سے لہو ٹپکائے گی

اس کا جوڑا ایک بانبی اسکی کنگھی ایک جال	ناگ کالے ناگ سے بدتر ہے اسکا بال بال

اسکے ہاتھوں گندھ رہی ہیں جسقدر بھی چوٹیاں	ناگنیں بن جائینگی اک دن پئے ہندوستاں

لہرا کر پھانس سینوں میں چبھو جائینگے کل	بال یہ زنجیرِ پائے قوم ہو جائیں گے کل

مادرانِ دورِ مستقبل نہ ہو جائیں شکار	اس مشن اسکول کی ڈائن سے یارو ہوشیار

بادِ طوفانی ہوائے سرد بنکر آئی ہے
پیرزن سر ہند کی ہمدرد بنکر آئی ہے

۱۹۲۹ء

حیف اے ہندوستاں!

غیر کی خدمت گزاری، باہمی خوں ریزیاں — دوپہر کی دھوپ سر پر، اور یہ خوابِ گراں

حیف اے ہندوستاں صد حیف اے ہندوستاں!

بے زری کی ڈوبتی آنکھوں میں فاقوں کے نقوش — اہلِ دولت کی جبینوں پر شقاوت کے نشاں

حیف اے ہندوستاں صد حیف اے ہندوستاں!

قائدانِ قوم مکروہاتِ حبِّ مال و زر — شاعرانِ ملک مفروضاتِ سودائے بتاں

حیف اے ہندوستاں صد حیف اے ہندوستاں!

گوسفندوں کی سیادت میں ہیں شیروں کی کچھار — بوم کے زیرِ نگیں شہباز کا ہے آشیاں

حیف اے ہندوستاں صد حیف اے ہندوستاں!

ابر بن بن کر برستی ہیں، خبر بھی ہے تجھے؟ — گلشنِ اعدا پہ تیری باہمی خوں ریزیاں

حیف اے ہندوستاں صد حیف اے ہندوستاں!

عورتیں تک دشمنوں کی موت سے ڈرتی نہیں — آہ اے بیگانۂ ذوقِ حیاتِ جاوداں

حیف اے ہندوستاں صد حیف اے ہندوستاں!

رعبِ تیموری! کہاں جا کر کروں تجھ کو تلاش — عزمِ گردانِ مہابھارت! تجھے ڈھونڈوں کہاں؟

حیف اے ہندوستاں صد حیف اے ہندوستاں!

۱۹۳۱ء

بھوکا ہندوستان

ایک مفلس کے مکاں میں کل ہوا میرا گزر
خاک پہ بیٹھا تھا بچہ اور بیوی تخت پر

تخت اینٹوں کی کمی بیشی سے ناہموار تھا
وزن اک نازک سی عورت کا بھی جس پہ بار تھا

تیرہ قسمت گھر کا مالک پائمالِ صد جنوں
بوریے پر اک طرف بیٹھا ہوا تھا سرنگوں

سر پریشانی پہ تھا چھایا ہوا دل کا دھواں
جس میں غلطاں تھیں شرافت کی سلگتی چنگاریاں

اُس کی ہستی فقر سے تھی اس قدر نامعتبر
مارتے تھے قہقہے جہّال جس کے علم پر

تھا وہ یوں افلاس کے ہاتھوں گرفتارِ قلق
ہر سبک سر کو تھا جس پر معترض ہونے کا حق

تھا وہ اس منزل میں جب رہتی نہیں چہرے پہ آب
مانتا ہے شیخ کے دعوے جب انساں کا شباب

فاقہ کش انسان جب ہوتا ہے یوں زیر و زبر
جھینپتا ہے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر

جب سبک ہوتا ہے اس درجہ محبت کا نیاز
خود شریکِ زندگی بھی ترک کر دیتی ہے ناز

جب کوئی غربت سے پیش آتا ہے تو مردِ حزیں
سوچنے لگتا ہے مجھ کو بناتا تو نہیں!

زندگی جس وقت ہو جاتی ہے اتنی پائمال
وہم بن جاتا ہے خود اپنی شرافت کا خیال

دل میں جب احساسِ حرمت کا نہیں رہتا ہے دم
کفر کی سرحد پہ جب پڑتے ہیں انساں کے قدم

جب یوں خستہ حال انساں کا ذوقِ وفا
خلق کی نظروں میں بنتا ہے مدد کی التجا

زندگی ہوتی ہے جب اس درجہ عبرت آفریں
تخلیے کا دوست بھی موقع کبھی دیتے نہیں

جب خزف معلوم ہوتے ہیں خود اپنے ہی گہر
وہم ہوتا ہے رکاکت کا خود اپنی وضع پر

رخ پہ جب ہوتے ہیں ایسی خستہ حالی کے نشاں
جس کے "سچ" پر "جھوٹ" کا ہوتا ہے دنیا کو گماں

اس مصیبت سے تھی اس کی زندگی زیر و زبر
جس مصیبت میں شرافت تولنے لگتی ہے پر

اس کے سر پہ تھا تہی دستی کا وہ بار گراں
بولنے لگتی ہیں جس سے زندگی کی ہڈیاں

مفلسی کے اس کنایے پہ تھا وہ گرم خرام
ترک کر دیتا ہے بیٹا، باپ کا جب احترام

الغرض چھائی ہوئی تھی یاس سقف و بام پر
روح تھرانے لگی میری یہ منظر دیکھ کر

گھر تھا یا اک کارواں بھٹکا ہوا، کھویا ہوا
خفتہ تھی قسمت مکینوں کی، مکاں سویا ہوا

یہ مکاں اک قصر عالی کا تھا اک ایسا مقام
تھا جہاں کل اس کے آبا کے غلاموں کا قیام

جس طرف اس کا لڑکپن بھول کر جاتا نہ تھا
عہد طفلی میں جدھر یہ کھیلنے پاتا نہ تھا

جو مکاں کل نغمۂ خدام سے پر جوش تھا
آج آقا کو لیے آغوش میں خاموش تھا

پوچھتا جاتا تھا لیکن خیریت سے تو ہیں مکیں
مجھ میں اک مدت سے کوئی قہقہہ گونجا نہیں

طاق پہ رکھا ہوا تھا ایک سویا سا چراغ
طاق کے نیچے تھے کڑوے تیل کے دو ایک داغ

تیل بہنے کا نشاں دیوار پہ پھیلا نہ تھا
ایک دن بھی وہ دیا شاید کبھی چھلکا نہ تھا

اس حقیقت کو سمجھ سکتے نہیں اہل فراغ
اور ظلمت کو بڑھا دیتا ہے مفلس کا چراغ

سرد چولھے کے قریب اڑتا ہوا پھیکا غبار
الگنی پہ چند کپڑے اور وہ بھی تار تار

جا بجا سے پپڑیاں دیوار کی چھوٹی ہوئی ۔۔۔ دھجیاں گِنتی کی تھیں اُن میں بھی کچھ ٹوٹی ہوئی
ایک گوشے میں تھا بستر کے عوض تھوڑا سا پیال ۔۔۔ جس پہ دو ٹکڑے دری کے، اور اک صد پارہ شال
شال کے مر تار میں خوابیدہ سو نقش و نگار ۔۔۔ عہدِ ماضی کی یہی لے دے کے تھی اک یادگار
بچّہ بہلا سا ہوا تھا خاک کے اِک ڈھیر سے ۔۔۔ ماں دوپٹہ سی رہی تھی سر جھکائے دیر سے

کھیلنے میں طفلکِ گل فام تھا ڈوبا ہوا
آئی اِتنے میں گلی سے آم والے کی صدا

کانپتی آئی صدا، ہلنے لگا بچّے کا دل ۔۔۔ سانس لی یوں جیسے رکھی ہو کوئی چھاتی پہ سِل
ہو گئی اگلی ضدوں کی یاد سے دُنیا سیاہ ۔۔۔ ماں کے چہرے کی طرف ڈالی جھجکتی سی نگاہ
ماں کی نظریں اُٹھ گئیں، اُٹھ کر پھریں، پھر کر جھکیں ۔۔۔ "ہائے میرے لال! میرے پاس تو کچھ بھی نہیں"
دیکھ کر ماں کی اُداسی ہو گئی پامالِ یاس ۔۔۔ انکھڑیوں میں آم کی سُرخی، تخیّل میں مٹھاس
ہونٹ کانپے خود بخود، اور رہ گئے پھر کانپ کے ۔۔۔ دل میں پھر چبھنے لگے اگلی ضدوں کے تجربے
راستے میں آ گئی دیوار، نالے چڑھ گئے ۔۔۔ مُنہ میں تھرّائی زباں، الفاظ آگے بڑھ گئے
چھا گیا چہرے پہ سنّاٹا دلِ ناکام کا ۔۔۔ "اشک" بن کر آنکھ سے ٹپکا "تصوّر" آم کا
چہرہ مرجھایا، نفس بوجھل سا کچھ ہونے لگا ۔۔۔ دل کے سنّاٹے میں بچپن کھو گیا سونے لگا

نیم جاں ماں باپ کی نظروں کے خط ملنے لگے
باپ کا سر، اور دُکھیا ماں کے لب ہلنے لگے!!

آہ اے ہندوستاں! اے مفلسوں کی سرزمیں   اس کرے پر کوئی تیرا پوچھنے والا نہیں
آہ اک دل بھی ترے افلاس پر ہلتا نہیں   اب تو اک روٹی کا ٹکڑا بھی تجھے ملتا نہیں
ہندو و مسلم نہیں اُٹھتے تری امداد پر   تُف ہے ایسی بے حمیّت ناخلف اولاد پر
ہائے کیا کرنا تھا ان کو، اور کیا کرتے ہیں یہ   گائے اور باجے پہ لڑنے کے لئے مرتے ہیں یہ
اِس طرف ہے، خوبیٔ قسمت سے باجا اور گائے   اُس طرف افلاس کے مارے ہوؤں کی ہائے ہائے
ناخلف بچّے تری جانب نظر کرتے نہیں   ان کو عشقِ میداں میں مرنا چاہیے مرتے نہیں
سخت ہو جاتی ہے اس سے ہر کڑی زنجیر کی   مار کر اپنوں کو مرنا موت ہے خنزیر کی

اِن سے کہدے، تا کجا بربادیاں؟ آباد ہو
یا گلے خود کاٹ کر مر جاؤ، یا آزاد ہو

آہ اے ہندوستاں! اے کشورِ زار و نزار   تیرے بچّے بھی بلکتے ہیں، جواں بھی بیقرار
تیرے مُردوں کا کفن تک لے گئے چالاک چور   شق ہوا ہے تاریک جیتے جاگتے مُردوں کی گور!
تیرے اُوپر آ کے ٹھہرا ہے ٹھگوں کا قافلا   جھوم کر بیٹھ! اے بھیا تک لیا اپنی بلا
اے بھڑکتی آگ! ٹھنڈی راکھ کی تہ سے نکل   اے رگِ غیرت! اُبھر، اے خون کے چشمے! اُبل
گردنیں طوقِ غلامی سے ہوئی جاتی ہیں کج   اے کڑکتی برق! گِر، اے جھومتے بادل! گرج

تا کجا یہ خواب؟ اے ہندوستاں! آ ہوش میں
آج بھی ہیں سیکڑوں ارجن ترے آغوش میں

آ رہی ہے کب سے رہ رہ کر صدائے انقلاب — زندہ ہے تو اے وطن! دیتا نہیں پھر کیوں جواب؟

زندہ ہے تو، میری ہمت کو پرِ پرواز دے — وہم ہوتا ہے مجھے "آواز دے" آواز دے!!

یہ اجل کی بے حسی ہے، یا فقط خوابِ گراں؟

بول اے ہندوستاں! ہندوستاں!! ہندوستاں!!

۱۹۳۰ء

نغمۂ قفس

آگ ہے لحنِ طائرِ آزاد

خاک ہے طائرِ قفس کی لے

ہم صفیرو! گلے کی ساخت کو بھی

کیا اسیری بگاڑ دیتی ہے؟

۱۹۳۴ء

بہتے ہوئے خون کی برادری

مژدہ باد اے ایشیا! اے سرزمینِ زرفشاں
آگئی وہ ساعتِ بیداریٔ ہندوستاں

مژدہ باد اے سرزمینِ ہند! اے جنّت سواد
میان سے باہر نکلنے ہی پہ ہے تیغِ سواد

سرخ پرچم کھولنے پر ہے شقاوت کا جنوں
تیرے ذرّوں پر بہے گا ہندو و مسلم کا خوں

لیکن اس سے نوحہ رساں ہو نہ اے ارضِ مراد!
خون کا سیلاب دھو دیتا ہے ہر بغض و عناد

رشتہ کٹ جاتا ہے بہتے خون سے اوہام کا
خانہ جنگی غسلِ صحت ہے علیل اقوام کا

یاد رکھو جذبۂ غیرت میں جوش آجائیگا
خوں بہا تو ہندو و مسلم کو ہوش آجائیگا

غنچۂ امّیدِ اربابِ وطن کھل جائے گا
خاک پر بہتے ہی دونوں کا لہو مل جائے گا

دھمکی

تو نے شاعر سے یہ اے غاصبِ حکومت کیا کہا
"تو نہ مانے گا مجھے تو قتل کر دونگی تجھے"

قتل سے ڈر جاؤنگا، اتنا سمجھتی ہے ذلیل
جا، اور ایسی سوقیانہ قسم کی دھمکی نہ دے

سنہ ۱۹۳۴ء

پیاسی ندّی

اے برادر! پل پہ جب گنگا کے آجاتی ہے ریل | پھینکتا ہے کس لئے سکّے یہ کیا کرتا ہے کھیل؟
قوم کی آنکھوں سے جاری ہیں لہو کی ندّیاں | ڈوبنے ہی پر ہے جن میں عزّتِ ہندوستاں
کیوں نہیں کرتا ہے تو اس خون کی ندّی کا پاس | جسکو گنگا سے کہیں بڑھ چڑھ کے ہے سکّوں کی پیاس
ڈوب کر گنگا میں اک پیسہ ابھر سکتا نہیں | ہند کی آنکھوں کے آنسو خشک کر سکتا نہیں
کار آمد ہے جو آبِ زندگانی کی طرح | تو بہا دیتا ہے اُس دولت کو پانی کی طرح
دیکھ کر تیری یہ نادانی، یہ کارِ ناصواب | شرم کے مارے ہوئی جاتی ہے گنگا آب آب
بازوئے زر ناخدائی کے لئے طیّار ہو | ڈوبنے والی ہے کشتی قوم کی ہشیار ہو

کی گئی ناوقت قربانی تو پھر کیا فائدہ
سر سے اونچا ہو گیا پانی تو پھر کیا فائدہ

۱۹۳۱ء

بادشاہ کی سواری

پرے جمائے ادب سے کھڑے ہوئے ہیں سوار
سڑک پہ رُعب ہے، جنبش میں ہیں در و دیوار

چلے تو کیسے چلے نبضِ کوچہ و بازار
اُبل رہا ہے تحکّم، برس رہا ہے وقار

زمیں پہ چرخ سے تنویرِ ماہ آتی ہے
ہٹو، بچو کہ سواریٔ شاہ آتی ہے

سڑک ہے بند، پڑا ہے رُکا ہوا ہر کام
نہ جانے کتنے گھروں میں بپا ہے اک کہرام

ہٹا رہے ہیں غریبوں کو سلطنت کے غلام
برس رہے ہیں جو کوڑے تو گر رہے ہیں عوام

سواریٔ شہِ گردوں وقار آتی ہے
نویدِ رحمتِ پروردگار آتی ہے

"ارے یہ موٹر پہ تیورا کے کون شخص گرا؟"
"حضور! ساٹھ برس کی مریض اک بڑھیا"

"اسے ہٹاؤ یہاں سے، یہ ہے شگون بُرا"
لبوں پہ جان ہے، چلتا ہے سانس کا ڈورا

اسے ہٹاؤ کہ اس کا اثر بُرا ہو گا
جبینِ شاہ پہ بل پڑ گئے تو کیا ہو گا

"سفید ہو گئیں آنکھیں، اکڑ چلا ہے بدن"
"گلے میں سانس ہے، ڈھلنے ہی پر ہے اب گردن"

"حلال خور ہے کیا اپنی جان کا دشمن		"اسے گھسیٹ کے، گھوڑے پہ ڈال دے فوراً"

"جہاں پناہ غضب ناک ہو نہ جائیں کہیں"
"نگاہیں شاہ کی ناپاک ہو نہ جائیں کہیں"

بگل بجا، وہ سواری شہریار آئی		خزاں کی رات گئی، صبح نو بہار آئی
خدا کا شکر کہ پھر بار مشکبار آئی		"ادب کے ساتھ" کی آواز بار بار آئی

فلک نے جان لیا، اور زمین مان گئی
کسی کی آئی سواری، کسی کی جان گئی

سنہ ۱۹۳۰ء

اِنتباہ

ڈرو اُس وقت سے اے دشمنانِ امن و آسائش
بنالیں جب حکم خوں ریز تلوار دل کو ہم اپنی
کہ ان کا فیصلہ کچھ اس قدر دو ٹوک ہوتا ہے
کہ دو ٹکڑوں میں ذرّہ بھر کمی بیشی نہیں ہوتی

سجّاد سے

("اگر پدر نتواند، پسر تمام کند")

اے مری آنکھوں کے تارے، اے مرے لختِ جگر
خلد کی تیرے دم سے ہے فردوس آغوشِ پدر

لیکن اے نورِ نظر یہ دَور مٹ جانے کو ہے
زندگی میں ایک دَورِ تلخ بھی آنے کو ہے

یہ زمانہ طَور سے بے طَور ہو جائے گا کل
یہ زمیں، یہ آسماں، کچھ اور ہو جائے گا کل

اِس ورق کو جب اُلٹ دے گی ہوائے انقلاب
مجھ پہ یعنی بند ہو جائے گا جب ہستی کا باب

میرے مرتے ہی چلے گی وہ قیامت کی ہوا
پھیر لیں گے تجھ سے مُنھ، ظالم عزیز و اقربا

گو، خدا کا شکر ہے بھائی کوئی تیرا نہیں
تجھ کو "نادر زاد" دشمن کا کوئی کھٹکا نہیں

پھر بھی خونی اقربا کے صید ہوتے ہیں یتیم
بیکسوں کی آہ ہے اُن کیلئے موجِ نسیم

لطف کے پردے میں کرتے ہیں یگانے پائمال
مہر کی نظریں یتیموں کیلئے بنتی ہیں جال

جو چھڑکتے ہیں پسینے پر ترے خونِ جگر
کل پسینہ بھی نہ ٹپکائیں گے تیرے خون پہ

باپ کے مرتے ہی ہو جاتی ہے دنیا خشمگیں
اِس تلاطم میں زمیں برسوں جگہ دیتی نہیں

ہو چکا ہے اقربا کے ہاتھ سے پامال دیکھ
دُور کیوں جاتا ہے، اپنے باپ ہی کا حال دیکھ

دیکھ، کیونکر میرے دل کو پارہ پارہ کر دیا
مہر کو کچھ اِس طرح توڑا کہ تارا کر دیا

لیکن اس ہلچل میں ہو جاتا ہے جس سے جی نڈھال
عزتِ دیرینۂ اجداد کا رکھنا خیال

ہر نفس تیار رہنا ہر بلا کے واسطے — صاحبِ سیف و قلم بننا خدا کے واسطے
ضعف ہے روزِ ازل سے تیرہ بختی کا نشاں — زورِ علم و قوتِ بازو ہے شانِ کردگار
دل ہے تسخیرِ قوائے بحر و بر کے واسطے — ناتوانی کفر ہے نوعِ بشر کے واسطے

قبر میں روحِ پدر کو شاد کرنے کے لئے
سر کٹانا ہند کو آزاد کرنے کے لئے

ہاں تو میں تجھ سے یہ کہتا تھا کہ اے جانِ پدر — جب مرا ہو جائے گا اس دارِ فانی سے سفر
رونے والوں کو مرے مرنے پہ آ جائے گا صبر — شہر سے باہر کسی گوشے میں ہوگی میری قبر
محو ہو جائے گی دل سے کلفتِ مرگِ پدر — وقت کے مرہم سے بھر جائیگا یہ زخمِ جگر
ہوں جو ہونگے دلنشیں منظر، ترانے بے بدل — ثبت ہوگی میری چشم و گوش پر مہرِ اجل
ہونگی طالع کس قدر صبحیں پراگندہ نقاب — میں نہ دیکھوں گا مگر تا حشر بیداری کا خواب
چاند اوجِ آسماں سے نور جب برسائے گا — ساحلِ گل ریز پر مجھ کو نہ لیکن پائے گا
بدلیاں برسات کی کیا کیا نہ ہونگی بے قرار — میرے اجڑے باغ میں لیکن نہ آئے گی بہار
جائے گا آوازہ میری شاعری کا دور دور — خاک کے بستر سے ہوگا نطق میرا چور چور

یوں تو آتا ہے نہ اس دل میں تلاطم آئے گا

قبر پر تو آتے، تو لب پر تبسم آئے گا

لیکن اے جانِ پدر! دنیا ہے وہ مضبوط جال — آدمی کا جس کے پھندوں سے نکلنا ہے محال

تو نئے ماحول میں اُس وقت ہوگا غالباً — اور نئے احباب سے معمور ہوگی انجمن!

ہو سکے گی یاد بھی میری نہ بھولے سے مخل — کارِ ہستی میں ترا اِس طرح لگ جائیگا دل

عہدِ پارینہ کو انساں وقت دے سکتا نہیں — آدمی اِس کشمکش میں سانس لے سکتا نہیں

پھر بھی اِس طوفان میں اے جوش کی روحِ رواں — مادر و خواہر کی خدمت کو سمجھنا حرزِ جاں

اور اس کے بعد اے جانِ تمنائے پدر! — چند لمحوں کی بھی فرصت دے تجھے دنیا اگر

باپ کی سوتی ہوئی قسمت جگانے کیلئے — قبر پر دو پھول لے آنا چڑھانے کے لئے

باغِ ہستی کے، نہ وہ باغِ جناں کے پھول ہوں
مژدۂ آزادیِ ہندوستاں کے پھول ہوں

۱۹۳۳ء

کہاں تک؟

آشفتہ سری اے دلِ ناکام کہاں تک؟ — یہ شکوۂ بے مہریِ ایّام کہاں تک؟

دارائیِ اسلاف پہ تا چند یہ ماتم؟ — انجامِ تنعّم پہ یہ کہرام کہاں تک؟

اِس دغدغۂ گردشِ افلاک سے حاصل؟ — یہ وسوسۂ فتنۂ ایّام کہاں تک؟

پروانہ صفت جھونک بھی دے آگ میں خود کو — آغاز میں اندیشۂ انجام کہاں تک؟

اے رہبرِ گمراہ! یہ غدّاریاں تا چند؟ — او ننگِ زمانہ! ہوسِ نام کہاں تک؟

اُٹھ رعد کے آغوش میں ہے نغمۂ شیریں — یہ سازِ طرب کی ہوسِ خام کہاں تک؟

اُس صرصر و سیلاب میں ہے رُوحِ شبستاں — یہ ذوقِ شبِ ماہ و لبِ جام کہاں تک؟

جو دوڑ میں پیچھے تھے بہت بڑھ گئے آگے — اے پائے طلب! رشتۂ اوہام کہاں تک؟

گردوں پہ حریفوں نے بنائے ہیں نشیمن — اے پست نظر! سیرِ لبِ بام کہاں تک؟

ہمّت ہو تو مطلوب ہے خود کیوں نہیں ملتا — یہ سلسلۂ نامہ و پیغام کہاں تک؟

ہاں دیکھ حریفوں کے چھلکتے ہوئے ساغر — اے تشنہ وہاں! دُردِ تہِ جام کہاں تک؟

کیوں قوّتِ پروازِ پریشاں نہیں لاتا — اے مرغِ قفس! نالۂ تہِ دام کہاں تک؟

خود خوشۂ انگور نچوڑا نہیں جاتا — اغیار سے دریوزۂ یک جام کہاں تک؟

ہاں خود و زرہ بھی تو ہے اسلام کا زیور — پہنے گا فقط جامۂ احرام کہاں تک؟

۱۹۲۳ء

اُٹھ اَور زمیں پہ نیا لالہ زار پیدا کر — نہ آئی ہو جو کبھی وہ بہار پیدا کر

عُقولِ مُردہ و مرطوبِ نوعِ انساں میں — شرار و شُعلہ و دود و بخار پیدا کر

زباں کی بزم میں گُلکاریوں سے کیا حاصل — عمل کی راہ میں گرد و غبار پیدا کر

رہے نہ نسلِ جہنّم نہ آلِ خُلدِ بریں — نئے اصول کے مردانِ کار پیدا کر

نیا نظامِ سزا و جزا مقرّر ہو — نیا تخیّلِ روزِ شُمار پیدا کر

ضمیرِ اہلِ مُناجات کے تعطّل میں — خروشِ جذبۂ تکمیلِ کار پیدا کر

نظامِ کہنۂ نیلی رواق، وہم و فریب — نیا تصوّرِ لیل و نہار پیدا کر

غلط ہے سازِ عجم ہو کہ لحنِ اعرابی — نیا ترانۂ سرِ شاخسار پیدا کر

بہت بلند ہے سطحِ مذاقِ فکرِ جدید — نظر میں اَوجِ سرِ کوہسار پیدا کر

فسردہ گامیِ اہلِ جہاں کے حلقے میں — جواں خرامیِ ابرِ بہار پیدا کر

کُلاہِ خواجگیِ کائنات کج کر کے — نیا زمانہ نیا روزگار پیدا کر

الٰہِ دھر ہے تو، یہ فسردگی تا چند — ہر ایک خار سے سو لالہ زار پیدا کر

جمی ہوئی ہے دماغوں پہ برف مدّت سے — دِلوں میں دَولتِ برق و شرار پیدا کر

مذاقِ بندگیٔ عصرِ نو کی تجھ کو قسم نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر

بہار میں تو زمیں سے بہار اُبلتی ہے
جو مرد ہے تو خزاں میں بہار پیدا کر

۱۹۳۵ء

غرورِ ادب

میرے جلسے سے اُٹھ آنے پر خفا ہے ہمنشیں؟ شاعرِ ذی فطرتِ عالی سے تو واقف نہیں
جوہرِ ذاتی کا جب افسردہ ہوتا ہو وقار کفر سے بدتر ہے اُس موقع پہ وضعِ انکسار
ناشناسانِ ادب بھولے ہوئے ہوں جب شعور اُن مواقع پر عبادت کے برابر ہے غرور
دل ہمارا جذبۂ غیرت کو کھو سکتا نہیں ہم کسی کے سامنے جھک جائیں، ہو سکتا نہیں
راہِ خودداری سے مر کر بھی بھٹک سکتے نہیں ٹوٹ تو سکتے ہیں ہم لیکن لچک سکتے نہیں
حشر میں بھی خسروانہ شان سے جائیں گے ہم اور اگر پرسش نہ ہوگی تو پلٹ آئیں گے ہم

اہلِ دنیا کیا ہیں اور اُن کا اثر کیا چیز ہے
ہم خدا سے ناز کرتے ہیں بشر کیا چیز ہے

۱۹۳۶ء

مردِ انقلاب کی آواز

اگر انساں ہوں، دُنیا کو حیراں کر کے چھوڑوں گا
میں ہر ناچیز ذرّے کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

تری اس زلف کی سوگند اے لیلائے رنگینی
کہ ارضِ خار و خس کو سُنبلستاں کر کے چھوڑوں گا

وہ پنہاں قوتیں جو رِل کے زک دیتی ہیں دنیا کو
اُنہیں آپس ہی میں دست و گریباں کر کے چھوڑوں گا

سرِ تقلید کو مغزِ تفکّر سے جلا دے کر
چراغِ مُردہ کو مہرِ درخشاں کر کے چھوڑوں گا

شعارِ تازہ کو بخشوں گا آب و رنگِ جمعیّت
رسُومِ کہنہ کی محفل کو ویراں کر کے چھوڑوں گا

چراغِ اجتہادِ نَو بہ نَو کی جلوہ ریزی سے
سرِ راہِ خرد مندی چراغاں کر کے چھوڑوں گا

مُسلّط ہیں ازل کے روز سے جو ابنِ آدم پر
میں اُن اوہام کو سر در گریباں کر کے چھوڑوں گا

ترے اِس پیچ و خم کھاتے دھوئیں کو شمعِ حق بِینی

فرازِ عقل پر ابرِ خراماں کر کے چھوڑوں گا

جو انساں آج سنگ و خشت کو معبود کہتا ہے

اُس انساں کو الوہیت بداماں کر کے چھوڑوں گا

قناعت جس نے کر لی ہے عناصر کی غلامی پر

میں اُس کو کردگارِ بادو باراں کر کے چھوڑوں گا

قسم کھاتا ہوں اے کوہِ الم! دستِ زلیخا کی

کہ داماں کو ترے یوسف کا داماں کر کے چھوڑوں گا

پکاروں گا کلیم نو کو طورِ عصرِ حاضر سے

جو کچھ کہہ دوں گا اُس کو دینِ ایماں کر کے چھوڑوں گا

مری حکمت، بشر کو دعوتِ نو دے کے دم لے گی

میں اِس بھٹکے ہوئے اِنساں کو اِنساں کر کے چھوڑوں گا

اگر یہ کفر ہے جو کچھ زباں پر میری جاری ہے

تو میں اِس کفر کو گلبانگِ عرفاں کر کے چھوڑوں گا

اگر عصیاں ہی پر موقوف ہے اِنساں کی بیداری

تو میں دُنیا کو غرقِ بحرِ عصیاں کر کے چھوڑوں گا

۱۹۳۷ء

شاعرِ ہندوستان

زندہ مُردوں کی ہے بستی کون سُنتا ہے یہاں
تا بہ کے چیخا کروں "ہندوستاں، ہندوستاں"

اِک نظر بھی قدردانِ جوہرِ قابل نہیں
ہند کے اُجڑے ہوئے سینے کے اندر دل نہیں

آئیں یوسفؑ بھی اگر بیٹھے ہوئے بازار میں
ایک گاہک بھی نہ پائیں ہند کے بازار میں

سچ کہا ہے ہند میں اندازِ گل ہوتا نہیں
اس چمن کی بلبلوں کو عشقِ گل ہوتا نہیں

ہند ہے وہ ملک جس میں کشمکش سے دُھوکے ہات
سو رہی ہے موت کے زانو پہ لیلائے حیات

وہ جماعت شرم سے نام اپنا لے سکتی نہیں
ایڈریس[1] سی چیز جو شاعر کو دے سکتی نہیں

آہ اے "ٹیگور" تو کیوں ہند میں پیدا ہوا؟
سچ بتا تو کس ادائے ملک پر شیدا ہوا؟

اس جگہ تو کانپتی ہیں قہر کی پرچھائیاں
زندگی غائب ہے، مُردے سانس لیتے ہیں یہاں

شعر کو بہروں میں ممکن ہی نہیں حُسنِ قبول
شاعرِ ہندوستاں ہے اصل میں جنگل کا پھول

جس کے گرد و پیش رہتا ہے بہائم کا ہجوم
روندتے ہیں جس کو چوپائے جھُلستی ہے سموم

جہل کا دریا ہے اور ناقدریوں کی لہر ہے
شاعرِ ہندوستاں ہونا خدا کا قہر ہے

---

[1] دہلی میونسپلٹی نے ٹیگور کو ایڈریس دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی جذبے کے تحت یہ چند شعر چند لمحوں کے اندر لکھے گئے ہیں۔

دردِ مُشترک

سُنتے ہیں طُوفان میں ڈوبا ہوا تھا اِک درخت

جس کی چوٹی پر ڈرے بیٹھے تھے دو آشفتہ بخت

ایک اُن میں سانپ تھا اور ایک سہما نوجواں

دو ضِدوں کا ایک بھیگی شاخ پر تھا آشیاں

سچ ہے دردِ مُشترک میں ہے وہ رُوحِ اتحاد

عشق میں جس سے بدل جاتے ہیں آئینِ عِناد

لیکن اے عاقل مُسلمانو، مدبر ہندوؤ!

ہند کے سیلاب میں اِک شاخ پر تُم بھی تو ہو

رنگ و بو
دریں زمانہ نشد کس حریفِ فریادم
بہ بلبلانِ چمن ہم گلے فرستادم
(حافظؒ)

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لئے
اگر رسُول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

(جوشؔ)

نسیم ہوتی ہے محوِ راحت، سکوت ہوتا ہے جب چمن میں
میں پیش کرتا ہوں اپنے آنسو خنک ستاروں کی انجمن میں

مرے گلستانِ شاعری میں لچکنے لگتی ہیں نرم شاخیں
نسیم، رقاصۂ گلستاں، ہنوز چلتی نہیں چمن میں

مجھے سنگھاتی ہیں روح پرور ہوائیں اُس وقت لُوٹ کے قدرت
شمیمِ گلشن ہنوز ہوتی ہے بند غنچوں کے پیرہن میں

سفید ہلکی سی چاندنی میں بلند ہوتے ہیں میرے نغمے
چٹکنے والی تمام کلیاں خموش ہوتی ہیں جب چمن میں

مرا دماغِ سحر پرستی ہمیشہ اُس وقت جاگتا ہے
فلک پہ جس وقت چاند ہوتا ہے ملگجے خوابِ پیرہن میں

ہنوز نغموں کی خوابگاہوں کے گرد ہوتے ہیں سُرخ پردے
ربابِ دل کا میں چھیڑتا ہوں حریمِ دوشیزۂ سخن میں

اِدھر ٹپکتے ہیں اشکِ سوزاں مری جھپکتی ہوئی مژہ سے
اُدھر دمکتی ہے کچھ کچھ افشاں افق کے گیسوئے پُرشکن میں
فضا میں ہوتی نہیں ہے لرزش خموش ہوتا ہے نطقِ عالم
بیکایک اُس وقت جاگتی ہے زبانِ فطرت مرے دہن میں
یہ اب تو دستور ہو گیا ہے کہ جوشِ اُلجھ رات بھیگتے ہی
سلگنے لگتی ہے سوزِ دل سے اِک آگ سی میرے تن بدن میں

سنہ ۱۹۲۳ء

صبُوحی

اُٹھ بربط و صراحی و مینا لئے ہوئے — رنگِ طلوعِ صبح ہے صہبا لئے ہوئے

ہر خار و خس ہے آئینہ دارِ عروسِ گُل — ہر برگِ گُل ہے عارضِ سلمیٰ لئے ہوئے

غنچے ہیں رنگِ نرگسِ غمّاں سے بہرہ یاب — جھونکے ہیں بُوئے کاکلِ زیبا لئے ہوئے

شبنم کا رس، نسیم کی خنکی، کلی کا رنگ — آئے ہیں طائرانِ دل آرا لئے ہوئے

کہتے ہیں جس کو روئے صنم کی ملاحتیں — وہ نشّے ہے اپنی چھاؤں میں صحرا لئے ہوئے

رُسوائیوں کا خوف ہے کیفیتِ شبینہ کو — انگڑائیوں کا جوش ہے دریا لئے ہوئے

پھولوں کے دل ہیں شرحِ محبت سے چاک چاک — کلیوں کے لب ہیں حرفِ تمنّا لئے ہوئے

شبنم ہے برگِ تازہ پہ، شبنم میں سُرخیاں — آلوستاں ہیں دیدۂ موسیٰ لئے ہوئے

اے چشمِ جوشؔ افسردہ آ کہ لیلائے رنگ و بُو
چٹکی میں ہے نقاب کا گوشا لئے ہوئے

۱۹۲۶ء

ربودگی

ہو چکا ہے غروب، مہرِ منیر — سامنے اب نہیں کوئی تصویر

ہو چلا ہے اُداس ہر منظر — کیوں میں بیٹھا ہوں اب پہاڑی پر؟

سامنے کا ہرا بھرا جنگل — ہو چکا ہے نگاہ سے اوجھل

کھو سی جاتی ہے ظلمتوں میں نظر — بے کسی ہے گھنی کھجوروں پر

بھرنیوالے ہیں پل میں اب جل تھل — گھر گھر آتے ہیں چرخ پر بادل

گونج ہے بادلوں کی وادی میں — پڑ رہی ہیں بڑی بڑی بوندیں

بڑھتا جاتا ہے ابر و باد کا جوش — پھر بھی بیٹھا ہوا ہوں میں خاموش

اور یہ راز بھی نہیں کھلتا
کہ مجھے انتظار ہے کس کا؟

۱۹۲۷ء

دل نے ٹھنڈی سانس لی، خورشید اوجھل ہو گیا
رنگ اُڑا، صحرا ہوا خاموش، دریا سو گیا
لُو سمٹا، تیرگی پھیلی، ہوائیں رُک گئیں
پھول کمھلائے، چمن سنولائے، شاخیں جھک گئیں
رنگِ گل، شورِ چمن، جوشِ صبا، کچھ بھی نہیں
ایک غم انگیز وحشت کے سوا کچھ بھی نہیں
اُڑ گیا رنگِ شفق، دِل چرخ کا تھرّا گیا
رفتہ رفتہ رُوئے عالم پر دھواں سا چھا گیا
اُس دھوئیں میں اپنی زرّیں روشنی کھوتے ہوئے
میں نے دیکھا، رُوحِ انسانی کو گم ہوتے ہوئے

سنہ ۱۹۲۵ء

برسات کی شفق

یہ شفق ہے؟ یا فرازِ چرخ پر عکسِ چمن — یا تصور میں کسی گُل پیرہن کا بانکپن
یا غریبِ خستہ جاں کے قلب میں یادِ وطن

یہ شفق ہے عارضِ جاناں پہ یا موجِ شباب — خواب گاہِ خسروِ خاور کا یا زرّیں حجاب
رُوحِ انسانی کا یا بھولا ہوا جنّت کا خواب

یہ سنہری دھاریاں نسیم کے یہ نقش و نگار — یہ زمرّد کی چٹانیں یہ طلائی آبشار
دیدنی ہے منتہائے صنعتِ پروردگار

آہ اِن جلووں سے دل کے زخم دیتے ہیں لہُو — قلب میں انگڑائی لیتی ہے کسی کی آرزو
رُوح کے پردوں میں جل اُٹھتی ہے شمعِ آرزو

اِن مناظر میں اُبلتی ہے ندی جذبات کی — تیز ہو جاتی ہے دل میں آنچ محسوسات کی
خُون کے آنسو رلاتی ہے شفق برسات کی

مِل رہا ہے سرخیوں میں ایک ہلکا سا دھواں — جھک رہا ہے رفتہ رفتہ آفتابِ زر فشاں
پستیوں میں سر بسجدہ ہے غرورِ آسماں

یاد آتی ہے کسی کی کم نگاہی کیا کروں — چھائی جاتی ہے ہر اک شے پر سیاہی کیا کروں
یہ مناظر کھائے جاتے ہیں الٰہی کیا کروں؟

۱۹۲۴ء

آدھی رات
اور
ربودگی کا ایک لمحہ

رات آدھی آچکی ہے خلق ہے مصروفِ خواب
نصف شب کے فاصلے پر جا چکا ہے ماہتاب

جھک چکا ہے پایۂ خاموشی پہ کھو کر جی کا زور
گرسنہ شیروں کی صورت، ہونکتی سڑکوں کا شور

اب نہیں اُن کارخانوں کی کلاہِ فخر کج
جن میں تھی بپھرے ہوئے بادل کی طوفانی گرج

ہو چکا ہے خامشی کی بزم میں ضم اب وہ خیال
گرم کل پُرزوں کی پیہم گھڑگھڑاہٹ کا جلال

رہ چکی ہے لیلیٔ امن و اماں بالائے طاق
اسلحہ کی کھڑکھڑاہٹ، قوّتوں کا طمطراق

شاہراہوں پر نظر آتا نہیں نزدیک و دُور
مرکبِ شاہی کا کرّ و فرّ، حکومت کا غرور

دفن ہے تکیوں میں اہلِ کبر کا ہر اک بناؤ
گردنوں کا خم، لبوں کی مُہر، چہروں کا کھنچاؤ

زر کے پیچھے دن کو پھرتے تھے جو گھبرائے ہوئے
سو رہے ہیں بستروں پر ٹھوکریں کھائے ہوئے

کہہ رہے ہیں کتنی اُلجھی حسرتوں کی داستاں
راستوں پر گاڑیوں کے پیچ و خم کھاتے نشاں

دن کو برپا تھی جو ہلچل کوچہ و بازار میں — ہو چکی ہے جذب گلیوں کے در و دیوار میں
زیست کے ماتھے پہ ہے لیلائے شب کا سرِ ہات — سرنگوں ہے دبدبۂ انگیزِ طوفانِ حیات
لڑنے والے سو رہے ہیں سنسان ہے میدانِ جنگ — اُڑ چکا ہے فکر کی ماری ہوئی دنیا کا رنگ
گھٹ چلا ہے مضمحل گیتی کے دل کا ارتعاش — مٹ چلی ہے ہیجان زدہ ہونکے سینوں کی خراش
چاندنی سے پا چکا ہے اک بڑی حد تک سکوں — دھوپ سے کھولا ہوا خاشاک کی نبضوں کا خون
پھر بھی اب تک کرب سے ذرات کے چہرے ہیں زرد — لے رہی ہے سسکیاں ویرانی ہوئی سڑکوں کی گرد
خنداں ہے چاند عالم پر بصد لطف و نیاز — جس طرح بیمار کی بالینِ غم پر چارہ ساز
سو رہے ہیں برق یا جھونکے ہوائے سرد کے — مفلسی کی تلخ فریادوں کو دامن میں لئے
سہہ کے فاقے سو چکے ہیں بندگانِ سوگوار — رزق کے وعدے کو ایفا کر چکا ہے کردگار
بن چکی ہے سینۂ رحمت میں اک ہلکی سی آہ — منعموں کی چینِ پیشانی غریبوں کی نگاہ
ہو چکی ہے سست گرمِ انفاس سے بوجھل ہوا — وقت کا پہیا نظر آتا ہے کچھ رکتا ہوا

سرنگوں ہے خاک پر سعی و عمل کی بارگاہ
خفتہ ہے عالم مگر بیدار ہے "عشق و گناہ"

لے کے انگڑائی اٹھی ہیں خواب سے خونخواریاں — جرم کے سینے میں ہیں شب خون کی طیاریاں
شحنۂ سلطان کے دل میں گرم ہے داغِ سراغ — جل رہے ہیں دھندلے دھندلے طاقِ سازش میں چراغ
پھر رہی ہے موت کا گویا مزا چکھنی ہوئی — شب روی دہشت کے سینے پر قدم رکھتی ہوئی

شب کی تاریکی سے ہیں اچھّے بُرے سب بہرہ مند
شانۂ عاشق پہ کاکُل، دوشِ سارق پر کمند

اِک طرف ہیں گرمِ شیون عاشقانِ نامُراد　　چاندنی میں ڈس رہی ہے اور بھی جاناں کی یاد
ہجر کی ماری جوانی کو سُلانے کے لئے　　کروٹوں پر کروٹیں ہیں نیند آنے کے لئے

کروٹوں میں چُبھ رہی ہے بے مزا لمحوں کی دُھار
جنبشِ مژگاں سے دامن رات کا ہے تار تار

خوش نصیبوں کو اُدھر ہے دعوتِ کام و دہن　　زینتِ آغوش ہیں شیریں عذار و سیم تن
میکدوں کی مسندوں پر مطربوں کی بزم میں　　ہیں گلوں میں نقرئی باہوں کی ہلکی ہیکلیں
خلوتوں میں راگنی کی طرح ہے گونجی ہوئی　　اک ملائم سرسراہٹ، ریشمی ملبوس کی
لعلِ عطر افشاں پہ قصاں ہے تبسم کی پھبن　　ماہِ نَو کے سامنے جس طرح برگِ یاسمن
گوشے گوشے میں ہے بزمِ ناز کے ہنستی ہوئی　　کنگنوں کی جھنجھناہٹ ساعدوں کی چاندنی
تیز تیز انفاس کی خوشبو، گلے کے ہار میں　　خلوتیں ڈوبی ہوئی رنگِ لب و رخسار میں

اِک طرف ساقی کی آنکھیں اک طرف جامِ شراب
کھیل میں مصروف ہے، اربابِ عشرت کا شباب

اور میں ہوں اس طرف زُلفِ تخیّل کا اسیر　　ذہن یوں صورت پذیر ہے جس طرح صانع کا ضمیر
چھو رہی ہے میری پیشانی کو اُن جذبوں کی سانس　　جن کی ہر کروٹ دلِ شاعر میں بن جاتی ہے پھانس

عود کر آیا ہے گویا اوّلیں دورِ شباب　　گرد ہیں گزری ہوئی راتوں کے صدہا ماہتاب

دل پہ ہے اُس پُر فشاں لمحے کی از خود رفتگی　　اک کڑی ہوتا ہے جو مابینِ مرگ و زندگی

جس کے سنّاٹے میں کھو جاتا ہے غوغائے حیات　　راگنی ہیں جو بدل دیتا ہے شورِ کائنات

خار سے دامن نہیں جس کا اُلجھتا راہ میں
اور جو مستقبل و ماضی کی ہے طوفاں گاہ میں

حال کے اُس لمحۂ نازک پہ کرتا ہے نظر　　نوکِ مژگاں سے ہوا کرتا ہے جو باریک تر

اور پھر اُس لمحۂ مبہم سے بے حدّ و قیاس　　کھینچ لیتا ہے حیاتِ جاودانی کی مٹھاس

اور اُڑ جاتا ہے پھر بے خود بنا چکنے کے بعد
دفعۂ حاضر کو تاجِ زر پنہا چکنے کے بعد

۱۹۲۶ء

برسات کی پہلی گھٹا

کیا جوانی ہے فضا میں، مرحبا صد مرحبا — چل رہی ہے رُوح کو چھُوتی ہوئی ٹھنڈی ہوا
آ رہی ہے دُور سے کافر پپیہے کی صدا — حُسن اُٹھا ہے خاک سے انگڑائیاں لیتا ہُوا

جھُوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

آرزوؤں میں ہے تلاطم، جوش ارمانوں میں ہے — حسرتوں میں ولولے ہیں، تازگی جانوں میں ہے
نوجوانی کا تبسّم سرد میدانوں میں ہے — روشنی ہے دشت میں، خوشبو بیابانوں میں ہے

جھُوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

مطربوں نے ساحلوں پر جا کے چھیڑے ہیں ستار — ہل دھرے کاندھوں پہ ہنستے جا رہے ہیں کاشتکار
مست ہے جنگل میں چرواہا، چمن میں جوئے بار — گا رہا ہے ناخُدا دریا کے سینے پر ملار

جھُوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

بستیوں میں نَے ہے گرم، زمزمہ جنگل میں بانس — جی اُٹھی ہے دھوپ کے مارے ہوئے میداں کی گھانس
لے رہے ہیں پھُول اطمینان سے باغوں میں سانس — ابر کے ناخن نے دل سے کھینچ لی گرمی کی پھانس

جھُوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

ماہ پیکر لڑکیاں رنگینیوں پر تُل گئیں — رنگ کی پُڑیاں ہزاروں ایکدم میں کھُل گئیں

لی جو گہری سانس دل کی کلفتیں سب ڈھل گئیں ؎ گرد کچھ اس طرح سے بیٹھی کہ آنکھیں کھل گئیں

جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

بھر دیئے پانی نے جل تھل، ندیاں بہنے لگیں ؎ چھوڑ کر شانوں پہ زلفیں مسکرائے نازنیں

آج ہے غرقِ سفیدی سُرخ تھی کل جو زمیں ؎ سر و پانی چوس کر ذرّوں نے آنکھیں بند کیں

جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

چھا گئی لو، دفعتہً آموں کے باغوں پر بہار ؎ اُٹھ رہی ہے سوندھی سوندھی سی شمیمِ خوشگوار

شاخ پر کوئل غزلخواں ہے، لبِ جو میگسار ؎ گا رہے ہیں رکھ کے ڈولی نیم کے نیچے کہار

جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

پڑ رہا ہے تیز پانی، ٹپک رہی ہیں بوریاں ؎ رقص کرتا جا رہا ہے موجِ باراں میں دھواں

مہوشوں کی زیب و زینت الحفیظ و الاماں ؎ ہر کلائی میں نظر آتی ہیں دھانی چوڑیاں

جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

ابر کے سیلاب میں ڈوبا ہوا ہے جزو و کل ؎ خار کی نبضوں میں بھی دوڑا ہوا ہے خونِ گل

صحن میں پانی ہے اور پانی میں ہے بچوں کا غل ؎ اک طرف لکڑی کی کشتی، اک طرف مٹی کا پل

جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

باہمی آویزشیں غمخواریاں سی بن گئیں ؎ بے زری کی کلفتیں زرداریاں سی بن گئیں

بھر گیا پانی، زمیں پر دھاریاں سی بن گئیں ؎ جا بجا مٹی جو سمٹی کیاریاں سی بن گئیں

جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

زندگی کی سرد نبضوں میں حرارت آگئی　　　　منعموں میں خُلق، کانٹوں میں نزاکت آگئی

ہجر کے افسردہ چہروں پر بشاشت آگئی　　　　حد ہے خوش چشموں کی آنکھوں میں مروّت آگئی

جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

۱۹۲۳ء

مغموم درخت

سڑک، غلغلہ، ہلچل، غبار　　　　دو رُویہ درختوں کی سیدھی قطار

کوئی ہے؟ کہ از راہِ سوز و گداز　　　　سُنے اِن درختوں کی کلیوں کے ساز

اسی طرح اِس مادّی عہد میں

کہاں دل کہ شاعر کے نغمے سُنیں

۱۹۲۷ء

پیغمبرِ فطرت

تاروں نے جھلملا کے جو چھیڑا ستارِ صبح   گانے لگی چمن میں نسیمِ بہارِ صبح
غنچوں کی چشمِ ناز سے ٹپکا خمارِ صبح   اُبھرا اُفق سے جامِ زمرّد نگارِ صبح

شاعر کی رُوح، عشق کی ہمراز ہو گئی
دُنیا تمام جلوہ گہِ ناز ہو گئی

شمعیں ہوئیں خموش، چہکنے لگے طیور   اُلٹی نقاب چرخ نے جھلکا زمیں پہ نُور
سینوں میں اہلِ دل کے ہوئے قلب چُور چُور   آنکھوں سے رُخ پہ دوڑ گیا آنسوؤں کا نُور

دریا بہے، چٹک گئیں کلیاں گلاب کی
پھُوٹی کچھ اِس ادا سے کرن آفتاب کی

سبزے پہ لہر آئی، جنوں خیز ہو گیا   جھونکا ہر اک نسیم کا گُل ریز ہو گیا
شب کا سکُوت لحنِ دلآویز ہو گیا   رنگِ حیات ولولہ انگیز ہو گیا

تنویر خندہ زن ہوئی تاریک رات پر
حُسنِ ازل کی چھوٹ پڑی کائنات پر

بادِ سحر کے جام پہ قرباں ہزار جم — دامن تمام شبنمِ تازہ سے جس کا نم
جھونکے نہیں یہ چرخ سے ہے بارشِ کرم — ہر سانس غسل دیتی ہے سینے کو دم بدم
تھی رُوح میں جو شب کی کثافت وہ دُھل گئی
گہری جو سانس لی تو گرہ دل کی کھل گئی

وارفتگی کی سینۂ مشرق میں ہے اُمنگ — ہر چیز میں حیات کی پیدا ہے اک ترنگ
گردوں کی آب و تاب سے ہوتی ہے عقل دنگ — ہلکا سا ابر، ابر میں یہ چمپئی سا رنگ
جامِ زمرّدیں میں ہیں موجیں شراب کی
شبنم میں چھپ رہی ہے کرن آفتاب کی

دُولھا بنے ہوئے ہیں شگوفوں سے بوستاں — کُندن بنی ہوئی ہیں پہاڑوں کی چوٹیاں
تاروں کا بزمِ چرخ پہ باقی نہیں نشاں — آنکھیں ہیں بند، ساکت و صامت ہے آسماں
ہاتھوں پہ آفتابِ درخشاں لئے ہوئے
حُسنِ ازل کا دِل میں تصوّر کئے ہوئے

رقصاں ہے بحرِ انجمنِ آفتاب میں — جس طرح رُوحِ سُکر ہو موجِ شراب میں
لہریں ہیں یا ہے زلفِ دوتا پیچ و تاب میں — غلطاں ہے رُوح، بادِ صبا کی حباب میں

موجیں رواں ہوئی ہیں کچھ اس سوز و ساز سے
جس طرح کوئی چونک پڑے خوابِ ناز سے

شمعیں بجھاتی آتی ہیں ٹھنڈی ہوا کی رَو — پروانے سرنگوں ہیں دھواں دے رہی ہے لَو
یہ وادیوں میں پھیل رہی ہے سحر کی ضَو — یا آ رہی ہے سر کو جھکائے عروسِ نَو
آنکھوں میں دل فریب تبسّم لیے ہوئے
کاکُل ہے پیچ و خم سے رُخ پہ سایہ کیے ہوئے

اے جوشؔ! دیکھ غور سے یہ رقصِ رنگ و بُو — تھی کب سے تجھ کو پیرِ نوجواناں کی آرزو
ہاں دیکھ! یہ تبسّمِ گُل، نازِ آبِ جُو — کُوکُو کی یہ صدائے دل افروز کو بکو
آنکھیں اُٹھا، علاجِ دلِ دردمند کر
پیہم صدائیں صلِّ علیٰ کی بلند کر

یہ صحنِ گلستاں میں ہری دوب کی ادا — یہ وادیوں کی اوس میں ڈوبی ہوئی ہوا
یہ کوئلوں کی کوک، پپیہے کی یہ صدا — رُخسارِ گُل پہ رنگ، یہ ہلکا سا دھوپ کا
رنگینیاں یہ سلسلۂ کوہسار کی
یہ تنگ گھاٹیوں میں صدا آبشار کی

یہ آب و تابِ چادرِ آبِ رواں، یہ نُور — نُزہت کا یہ ہجوم، لطافت کا یہ وفور
یہ دامنِ نسیم میں سرمایۂ سرور — بکھرے ہوئے زمیں پہ موتی یہ دُور دُور

یہ جھلکیاں سی پردۂ ظلمت میں نُور کی
یہ معرفت میں غرق، صدائیں طیُور کی

کچھ کہہ کے نجمِ صبح سے یہ الوداعِ ماہ
یہ کُنج کی نسیمِ خُنک، یہ ہری گیاہ
یہ نہر کی تڑپ کہ ٹھہرتی نہیں نگاہ!
یہ پنکھڑی کا ناز کہ اللہ کی پناہ

صحنِ زمیں پہ شب کی سیاہی لیے ہوئے
یہ آسمان، افسرِ شاہی لیے ہوئے

کُندن سے یہ کلس، یہ دل آویز کوہسار
یہ دل کشا چمن، یہ فرح بخش لالہ زار
شاخوں کا دلبری سے لچکنا یہ بار بار
یہ مہر کا جمال، نہ پنہاں، نہ آشکار

یہ آسمان جلوہ گری پر تُلا ہوا!
یہ حُسنِ لازوال کا پرچم کھلا ہوا

اے شیخ! تُو نہیں ہے حقائق سے بہرہ یاب
فطرت پرست جوش پہ اور اِس قدر عتاب
فِطرت بھی تیری طرح سے ہے صاحبِ کتاب
اِس دین کا صحیفۂ زریں ہے آفتاب

خاشاک کہہ رہا ہے جسے تُو، وہ پھُول ہے
ناداں! صباحِ غنچہ کُشا بھی رسُول ہے!

۱۹۲۶ء

شام کی بزم آرائیاں

جھٹپٹا ہونے لگا، تاریکیاں چھانے لگیں
بدلیاں جنگل میں اک وحشت سی برسانے لگیں

صبح کی رنگینیاں، خواب پریشاں ہو گئیں
ظلمتیں غمگیں فضا میں بال بکھرانے لگیں

پھول کمھلائے، چراگاہوں کا رنگ اڑنے لگا
ساحلِ خاموش پر مایوسیاں چھانے لگیں

تیرگی پھیلی، درخت اک دوسرے سے مل گئے
وحشتیں صحرا کے دل میں پیچ و خم کھانے لگیں

کروٹیں یوں لیں شفق نے آسماں پر جلد جلد
ناگنیں سی سبزۂ خودرو پہ لہرانے لگیں

طائروں نے پر سمیٹے، جھک گئیں شاخیں تمام
سو گئے ذرّے، ہوائیں آنکھ جھپکانے لگیں

رک کے دریا روح سے سرگوشیاں کرنے لگا
تھم کے موجیں چرخ کو آئینہ دکھلانے لگیں

پھر گھنے جنگل میں چھیڑا غم کی دیوی نے ستار
پھر خنک تاروں کی آنکھیں اشک برسانے لگیں

پھر خموشی کی حدیثِ غم نے بسمل کر دیا
پھر شفق کی داستانیں خون رلوانے لگیں

جتنی چوٹیں دل پہ کھائی تھیں ابھر آئیں تمام
جتنی شکلیں دل میں پنہاں تھیں نظر آنے لگیں

پھر کسی عشوے کا پرتو روح میں غلطاں ہوا
پھر کسی محفل کی شمعیں دل میں تھرّانے لگیں

پھر تخیّل کو اندھیرے نے سجھایا راستہ — پھر تصوّر میں گھٹا میں برق چمکانے لگیں

تیرگی نے پھر منوّر کر دیا قصرِ دماغ — ظلمتیں پھر حافظے میں نُور دوڑانے لگیں

میٹھا میٹھا درد پھر سینے میں پیدا ہو گیا — صُحبتیں بچھڑی ہوئی پھر ہائے یاد آنے لگیں

تا کُجا تاریک جنگل میں یہ بزم آرائیاں

جوشؔ! اب گھر چل کہ گہری بدلیاں چھانے لگیں

سنہ ۱۹۲۷ء

حسرت

خورشید جہاں تاب جب آنکھوں سے ہو اوجھل
آوارہ نظر آتے ہوں جب چرخ پہ بادل

سینے میں خیالات ہوں جب لا متناہی
چھائی ہو تر و خشک پہ ہلکی سی سیاہی

جب چرخ پہ دو چار ستارے نظر آئیں
پرتول کے جب نہر پہ طائر اُتر آئیں

جب خونِ شفق گرم ہوا اور سرد ہو صحرا
بہتا ہو جب آہستہ مچلتا ہوا دریا

جب چرخ پہ فانوس، مہِ نو کا ہو روشن
جیسے کسی نو عمر کا ٹوٹا ہوا کنگن

ہمراہ مرے جب کوئی ہمدم ہو، نہ ہمراز
کچھ دور سے جب بانسری کی آتی ہو آواز

کھنچ آئیں جب اس نقطۂ اسرار پہ جذبات
پیدا ہو خوشی سے الم انگیز خیالات

جب دردِ جگر اتنی لطافت سے ہو پیدا
دل کو خلشِ غم پہ بشاشت کا ہو دھوکا

ہو دل میں سمویا ہوا احساس کا جوہر
آنکھوں میں ہوں اشک اور تبسم ہو لبوں پر

جب شورشیں ادراک کی خاموش ہوں دل میں
جب شادی و غم دونوں ہم آغوش ہوں دل میں

جب موج ہوا میں نفسِ شام کی بو ہو
حسرت ہے کہ اس وقت مرے سامنے تو ہو

سنہ ۱۹۲۹ء

بھری برسات کی رُوح

تیرگی پُرہَول صحرا بے اماں، بادل سیاہ ——— ایک مَیں، اور یہ اندھیری رات کی خُونی سپاہ

گھاٹیاں تاریک، راہیں گُم، ہوائیں ناصبُور ——— رُوح فرسا طاقتوں کی حکمرانی دُور دُور

ابر پیچ و تاب میں، ہیجاں میں آبِ رواں ——— آسماں بپھرا ہوا، بھیگی زمیں کف در دہاں

جھینگروں کی تان، بادل کی گرج، پانی کا شور ——— مینڈکوں کے راگ، بجلی کی کڑک، نالوں کا زور

کون ہے اُلجھی ہوئی شاخوں کے اندر بیقرار؟ ——— کون مجھ کو گھورتا ہے جھاڑیوں سے بار بار؟

بجلیاں سی کُنج میں رہ رہ کے چمکاتا ہے کون؟ ——— رُوئے ظلمت کو یہ بالتفصیل دکھلاتا ہے کون؟

کون یہ آواز دیتا ہے، کہ آتا کیوں نہیں؟ ——— جوشؔ اِن ظلمت کے پردوں کو اُٹھاتا کیوں نہیں؟

ہاں لپک، اُٹھا وہ کوندا سا دلِ سرشار میں ——— اب میں سمجھا، کون ہے اِن پردہ ہائے تار میں

مجھ سے ملنے آئی ہے رتھ میں اندھیری رات کی

ہو نہ ہو، یہ رُوحِ مضطر ہے بھری برسات کی

سنہ ۱۹۳۰ء

پپیہن ناگن کالی رات

ایک دُکھیا، حزیں، پریشاں حال — پی کی دُوری سے جسکا جی ہے نڈھال

روتی رہتی ہے ساری ساری رات — اِک قیامت ہے جان پر برسات

سُوئے گردوں نظر اُٹھاتی ہے — دردِ دل اِس طرح سناتی ہے

"دیکھنے کی نہیں مری حالت — زرد ہوں" اے مناظرِ قدرت!

بادلوں سے ہلال کو ڈھانکو — اپنا خنجر نیام میں رکھ لو،

اے تر و تازہ حسنِ تو اِبن کی — اَے گلابی گھٹاؤ! ساون کی

جلدی اِس دیس سے گزر جاؤ — داری، اِک بُوند بھی نہ ٹپکاؤ

ورنہ مہکیں گے پھُول گلشن میں — آگ لگ جائے گی مرے تن میں

یُوں نہ پاپی پپیہے تان لگا! — جس نگر میں ہیں پی، وہیں اُڑ جا

دیکھ، پُروائی! دل نہ کُھملا جائے — کوئی جھونکا اِدھر نہ آنے پائے

زُلفِ ماضی سنوارنے والی — تُو ہے چوٹیں اُبھارنے والی

پی کی نگری میں جا کے بھر جَل تھل — میرے سر پہ گرج نہ او بادل

ہائے کیوں کر نہ اختلاج رہے　　پی ہیں پردیس میں براج رہے

سوجھتا ہی نہیں ہے ہات کو ہات　　ڈس رہی ہے نگوڑی کالی رات

کھائے جاتی ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا　　دل میں چبھتی ہے بوندیوں کی صدا

کیا ہوا اکھڑ کا ہائے جی کے زور　　مور جنگل میں کر رہے ہیں شور!

سوندھی سوندھی زمین کی خوشبو　　آنکھ میں بن رہی ہے کیوں آنسو؟

یوں ہی چھاتی جو دھڑکے جائیگی　　ہائے کس طرح نیند آئیگی

گھر اکیلا ہے! پڑ رہی ہے پھوار　　کیسا موُرکھ ہے! اے سکھی! اسنسار!

اے سہیلی! بجا نہیں اوسان　　یہ تو مجھکو بتا، ترے قربان

سیج سونی ہے اور برستی رات

باؤلی ہو گئی ہے کیا برسات

۱۹۲۴ء

بہار کی ایک دوپہر

بے چین ہیں ہوائیں، بادل ہے ہلکا ہلکا، — بھیڑیں چرا رہی ہیں دوشیزگانِ صحرا

کچھ لڑکیاں چنے کے کھیتوں میں گا رہی ہیں — کچھ پھول چن رہی ہیں، کچھ ساگ کھا رہی ہیں

بوڑھا کسان اپنی گاڑی پہ جا رہا ہے — کھیتوں کو دیکھتا ہے اور سر ہلا رہا ہے

زیرِ قدم جو برگِ پژمردہ آ رہے ہیں — ہر گام پر کچل کر نغمے سنا رہے ہیں

خورشید بادلوں میں کشتی جو کھے رہا ہے — کووں کا بولنا تک اک لطف دے رہا ہے

کھیتوں پہ دھندلی دھندلی کرنیں چمک رہی ہیں — سرسبز جھاڑیوں میں چڑیاں پھدک رہی ہیں

سورج ہے سر پہ، بادل سایہ کئے ہوئے ہیں — ٹھنڈی ہوا کے جھونکے گرمی لئے ہوئے ہیں

غنچے چٹک رہے ہیں گلزارِ زندگی کے — در کھل رہے ہیں دلِ پُر اسرارِ زندگی کے

خود اپنے حافظے میں جلوے دکھا رہا ہوں۔

کھویا گیا ہوں ایسا اپنے کو پا رہا ہوں

۱۹۲۳ء

شبِ ماہ

الاماں! کیا چاندنی چھٹکی ہوئی ہے دُور تک — گر رہے ہیں خاک پر چاندی کے لاکھوں آبشار

کہہ رہی ہے قلبِ سوزاں سے یہ ٹھنڈی چاندنی — جوش میں آتی نہ کب تک رحمتِ پروردگار

یہ شگوفوں کا تبسم، یہ ستاروں کا جمال — موجِ رنگیں کے یہ ہلکورے، یہ دریا کا نکھار

اُجلی اُجلی چوٹیوں پر یہ روپہلی چاندنی — یہ ہوا کی نغمہ ریزی، یہ سکوتِ کوہسار

جابجا یہ اَبر کے ٹکڑوں میں تاروں کی جھمک — دُور تک یہ جھاڑیوں میں جگنوؤں کا انتشار

یہ سنکتے سرو جھونکے کارواں در کارواں — یہ چمکتی چلبلی موجیں قطار اندر قطار

یہ بساطِ نہر پر چاندی کی نازک دھاریاں — یہ جبینِ آب پر الماس کے نقش و نگار

چادرِ آبِ رواں پر، یہ ضیائے مرتعش — صفحۂ موجِ خنک پر یہ نقوشِ بے قرار

تیرتا پھرتا ہے یہ بادل کے ٹکڑوں میں ہلال — یا زمرد کا سفینہ درمیانِ جوئبار

یہ کلی پر قطرۂ شبنم میں ہے نورِ قمر — آنکھ کی پتلی میں یا غلطاں ہے عکسِ روئے یار

یہ گھنی شاخوں سے چھن کر آ رہی ہے چاندنی

قلبِ شب میں، یا تصوّرِ صبح کا ہے بیقرار!

مدح فطرت میں نہیں اشعار یہ وردِ زباں — یہ جبینِ نطق کے سجدے ہیں اے پروردگار

ہاں مگر ماتم کے قابل ہے یہ احساسِ شکست
قامتِ فطرت پہ ملبوسِ زباں ہے تار تار

آہ اے فطرت! تری برنائیوں کے سامنے
بہترین الفاظ ہو جاتے ہیں میرے شرمسار

حسن تیرا، ذوقِ گویائی کے سی دیتا ہے لب
راگنی تیری، زباں کا توڑ دیتی ہے ستار

تیری محرابِ تجلّی میں، دفورِ شرم سے
سر جھکاتا ہے مرے زورِ بیاں کا افتخار

تیرا دریا نطق کی وادی میں بہہ سکتا نہیں
آدمی محسوس کر سکتا ہے، کہہ سکتا نہیں

۱۹۲۲ء

مبہم پیام

قلبِ صحرا میں جھٹپٹے کے وقت
دل میں غلطاں ہے ایک طرفہ اُمنگ
مجھ سے کہتا ہے کیا، خدا جانے؟
دھان کے کھیت پر شفق کا رنگ!

۱۹۲۳ء

مُنہ اندھیرے

منہ اندھیرے میں اُٹھا ہوں شعر کہنے کیلئے
تیرگی میں، نور کے دریا ہیں بہنے کے لیے
بُوئے گل، رنگِ اُفق، نازِ صبا، بانگِ ہزار
واہ، کیا ساماں ہیں بشّاش رہنے کے لیے
مُسکراتی آرہی ہے، صبح کی مشعل لئے
حورِ فطرت، مجھ سے اپنے راز کہنے کے لئے
وہ کلی چٹکی، وہ برسا رنگ، وہ پھوٹی کرن
ہنس کے وہ انگڑائی لی دریا نے بہنے کیلئے

۱۹۲۲ء

رُوحِ شام

مغرب کی وادیوں میں خورشید اُتر رہا ہے
تصویر بے خودی کا ہر نقش اُبھر رہا ہے

پامال و خشک پتّے بکھرے ہوئے پڑے ہیں
سرسوں کے کھیت سارے پھُولے ہوئے کھڑے ہیں

چرواہے جھٹپٹے کی تانیں سُنا رہے ہیں
چوپائے سر جھکائے میداں سے جا رہے ہیں

رُوحیں لرز رہی ہیں فرقت کے دل جلوں کی
ظلمت میں بج رہی ہیں یا گھنٹیاں گلوں کی

گلّے گزر چکے ہیں سبزا پڑا ہے رَوندا
کیا کیا مہک رہا ہے پھُولا ہوا اکروندا

اِک سمت چھوٹی چھوٹی رنگیں پہاڑیاں ہیں
اِک سمت گُل بداماں ڈھاکے کی جھاڑیاں ہیں

کیا دِل کشی بیاں ہو گلرنگ جھاڑیوں کی
ترشی ہوئی ہیں راہیں جن میں سے گاڑیوں کی

اِن جھاڑیوں کے اندر میری نظر لڑی ہے
دوشیزہ اِک گلرنگ ڈوبی ہوئی کھڑی ہے

سرشار جھاڑیوں کے نغمے سنا رہی ہے
محرابِ رنگ و بو میں شمعیں جلا رہی ہے

ٹیکا نہیں جبیں پہ نیلم جڑا ہوا ہے
اِک ہار سا گلے میں ترچھا پڑا ہوا ہے

رُخ پر اثر شفق کے آغوشِ تربیت کا
زُلفِ سیہ پہ جُنباں پرچم اُلوہیت کا

آنچل پڑا ہوا ہے زُلفِ سیہ پہ دھانی
غمگیں سُروں میں گُم ہے اُٹھتی ہوئی جوانی

اے جوش! ادب سے جھک جا، تو جانتا نہیں ہے
دربار میں ہے کس کے؟ پہچانتا نہیں ہے

اِس بھیس میں جو مستِ بیخود بنا رہی ہے
یہ رُوحِ شام تجھ کو جلوے دکھا رہی ہے

بہار آنے لگی

پھر بہار آئی، ہوا سے بوئے یار آنے لگی
پھر پپیہے کی صدا دیوانہ وار آنے لگی

پی کہاں کا شور اُٹھا، حق سرّہ کا غلغلہ
کوئلیں کوکیں، صدائے آبشار آنے لگی

کھیت جھومے، ابر مچلا، پھول مہکے، دل کھلے
کونپلیں پھوٹیں، ہوائے مشکبار آنے لگی

قُمریاں چہکیں، ہلے پودے، چلی ٹھنڈی ہوا
جام کھنکے، ٹوٹے مینا پہ بہار آنے لگی

پھر نسیمِ دلربا چلنے لگی مستانہ وار
پھر شمیمِ طُرّۂ گیسوئے یار آنے لگی

پھر سماعت سے نوائے کیف نے کی چھیڑ چھاڑ
سامنے پھر لیلیٔ نقش و نگار آنے لگی

پھر شگوفے مسکرائے، پھر چھٹی سینے میں سانس
جوشؔ! یادِ یار پھر بے اختیار آنے لگی،

۱۹۲۴ء

سیرِ گردُوں

صحرائے دلنشیں ہے اور شام کا سماں ہے　　"پنجاب میل" سینہ تانے ہوئے رواں ہے

اُٹھ اُٹھ کے سُرخیوں کے پردے سے گر رہے ہیں　　بادل کے چند ٹکڑے آوارہ پھر رہے ہیں

آوارہ پھر رہے ہیں یُوں بے رفیق و ناصر　　جس طرح جھٹپٹے کے بھٹکے ہوئے مسافر

رنگینیوں کا دریا طوفاں اُٹھا رہا ہے　　اِک رنگ آ رہا ہے اِک رنگ جا رہا ہے

اُف اِدامنِ شفق کا اندازِ دِلستانی

کلیاں تو ہیں گلابی اور گوٹ آسمانی

تا دُور اِک سنہرا دریا بھرا ہوا ہے　　خُونِ سخن رگوں میں لہریں سی لے رہا ہے

جی چاہتا ہے ہوتی ہیرے کی ایک کشتی　　کشتی پہ ساتھ ہوتا اِک مستِ نازِ ساقی

جُوئے شفق کے اندر کشتی کو ڈال دیتا

ارض و سما کو اپنے دِل سے نکال دیتا

مجھ سے قریب ہوتا گردوں کا بامِ رنگیں　　ساقی کی بانسری پر سُنتا کلامِ رنگیں

صحّت کا میری ساغر اِک لالہ فام پیتا　　پھر وں خُمِ شفق سے بھر بھر کے جام پیتا

تصویرِ آرزو میں رنگِ نشاط بھرتا　　اُس وقت تک برابر گردوں کی سیر کرتا

جب فرطِ دلبری سے ہلکی سی تیرگی ہیں

مُنہ دیکھتے ہیں تارے شبنم کی آرسی ہیں

۱۹۲۳ء

نیچر کی خوابگاہ

رحم کر! اللہ اے انجن کی سیٹی! رحم کر!

شام کا ہے وقت، ویرانے کا سنّاٹا نہ چھین

ذرّہ ذرّہ ہے یہاں، رَوندا ہوا تپتا ہوا

دو گھڑی نیچر کو سو رہنے دے اے اندھی مشین!

۱۹۲۹ء

البیلی صبح

نظر جھکائے عروسِ فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے

سحر کا تارا ہے زلزلے میں، افق کی لو تھرتھرا رہی ہے

روش روش نغمۂ طرب ہے، چمن چمن جشنِ رنگ و بو ہے

طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں، کلی کلی گنگنا رہی ہے

ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے

نگارِ مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے

طیور بزمِ سحر کے مطرب، لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں

نسیمِ فردوس کی سہیلی، گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے

کلی پہ بیلے کی کس ادا سے، پڑا ہے شبنم کا ایک موتی

نہیں، یہ ہیرے کی کیل پہنے، کوئی پری مسکرا رہی ہے

سحر کو مدِ نظر ہیں کتنی رعایتیں چشمِ خوں فشاں کی

ہوا بیاباں سے آنے والی، لہو میں سرخی بڑھا رہی ہے

شلوکا پہنے ہوئے گلابی، ہر اک شباب نکھری چمن میں
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا، ہوا میں پلّو سکھا رہی ہے

فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں ہلال کے گرد و پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے

کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر؟ چٹکتی کلیو! ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رَو میں یہ کس کی آواز آ رہی ہے؟

۱۹۲۵ء

لُو کی آمد آمد

طے صبح کی راہ کر چکی ہے — دیواروں سے دھوپ اُتر چکی ہے

خنکی کی اُلٹ پلٹ ہے مسند — میداں میں ہے لُو کی آمد آمد

آتی ہیں ہوائیں سنسناتی — پودوں کی دھڑک رہی ہے چھاتی

دوزخ میں بہشت ہے غزل خواں — شاخوں پہ چہک رہی ہیں چڑیاں

چوپائے ابھی سے ہانپتے ہیں — ہیبت سے درخت کانپتے ہیں

ہر سُو ہیں رواں دواں ہوائیں — لرزاں ہیں طیور کی صدائیں

تھم تھم کے نکل رہے ہیں شعلے — انبار سے خشک پتیوں کے

تیزی سے ہوائیں آ رہی ہیں — سن سن کی صدائیں آ رہی ہیں

یُوں گرد و غبار چھا رہا ہے — میداں کے حواس اُڑا رہا ہے

ہلکی سی شفق پہ کچھ گھٹا ہے — خورشید ذرا سا چھپ گیا ہے

میداں بدل رہا ہے کیا رُوپ — سایہ تھا ابھی، ابھی کڑی دھوپ

پر ہول ہوا کے ارغنوں ہیں — آموں کے درخت سرنگوں ہیں

گھبرائے ہوئے ہیں باغ والے　　ہو جائیں کہیں نہ خشک تھالے

پھرتے ہیں اِدھر اُدھر کھُلے سر　　کاندھوں پہ گھڑے نظر فلک پر

سُوکھی ہوئی گھانس ہے فسُردہ　　افسُردہ نہ کہیئے، بلکہ مُردہ

دوزخ کی نظر ہے، بزم جاں پر　　وحشت ہے زمین و آسماں پر

پہلو سے، زمیں بدل رہی ہے　　ذرّوں سے وُنڈک نکل رہی ہے

گرمی کی ہے باڑھ پر جوانی

ہر ذرّہ پکارتا ہے، "پانی"

۱۹۲۷ء

برباد لمحوں سے خطاب

رات آدھی آ چکی ہے خلق ہے مصروفِ خواب ابر کی ہلکی سی چادر میں ہے نورِ ماہتاب
اپنے شانوں پر اٹھائے ہے پہاڑوں کا وقار حاشیے پر شہر کے لانبے درختوں کی قطار
دل پہ ہے کچھ اس طرح کی بیخودی چھائی ہوئی بیشتر جس سے اچٹ جاتی ہے نیند آئی ہوئی
ملگجی سی چاندنی، کہرے کا ہلکا سا غبار عرش سے تا فرش ہر ذرّہ ہے گویا سوگوار
ابر کے ٹکڑوں میں ہے اس طرح زہرہ کا جمال یاس میں امید کا جس طرح مبہم سا خیال
یوں بجھا سا کچھ نظر آتا ہے گردوں کا چراغ جس طرح آلام کے جھونکوں میں قندیلِ دماغ
دل میں پیدا ہو رہا ہے یوں خیال اندر خیال جس طرح مطرب کی تانوں میں ہو ربط و اتصال

دل پہ طاری ہو چلا ہے جوشِ بیداری کا خواب
اٹھ رہی ہے رفتہ رفتہ روئے ماضی سے نقاب

دورِ افتادہ رفیقوں کو ملا ہے اذنِ عام ہو رہی ہے روح بچھڑے دوستوں سے ہم کلام
آہ وہ برباد لمحے زندگی کے گلستاں ہائے وہ گم کردہ جلوے نازشِ کون و مکاں
وائے وہ رنگینیاں نوخیز احساسات کی ہائے وہ مست جوانی راتیں بھری برسات کی
وہ مذاقِ عشق و ذوقِ آشنائی ہائے ہائے ہم زباں یاروں کی وہ رنگیں نوائی ہائے ہائے

آہ اے برباد لمحو! اے گزشتہ صحبتو

چھوڑ دو للّٰلہ اب شاعر کا دامن چھوڑ دو

تم دلِ ناشاد کو اب شاد کر سکتے نہیں زخم جو ناسور بن جاتے ہیں بھر سکتے نہیں

مفت میں بیٹھے بٹھائے خون رُلواتے ہو کیوں؟ اب اُن اُجڑی صحبتوں کو یاد دلواتے ہو کیوں؟

مہربانی کے عوض بیداد کرنے آئے ہو چارہ سازی وقت کی برباد کرنے آئے ہو

جاؤ، ورنہ صبر کی بنیاد تک ہل جائے گی

سعیِ ماہ و سال دیکھو، خاک میں مل جائے گی

۱۹۲۷ء

آواز کی سیڑھیاں

کل جھٹپٹے کے وقت، کہ تھا زرد آفتاب چھایا ہوا تھا عرصۂ ہستی پہ رنگِ خواب
ظلمت کی بڑھ رہی تھی لگاوٹ فضا کے ساتھ اک راگنی سی کھیل رہی تھی ہوا کے ساتھ
ہر سانس پر شفق کا گریباں تھا چاک چاک تھا اک خلا سا، وقت کے سینے میں ہولناک
اتنے میں آئی مل کے صدائے طیور سے
بن کے کسی نگار کی اک تان دور سے
بے صرفہ جستجو کی کہانی لیے ہوئے اک نوا سیرِ غم کی جوانی لیے ہوئے
نا آزمودہ غم کی جبیں چومتی ہوئی تپتی ہوئی، لرزتی ہوئی، جھومتی ہوئی
بیگانہ رسمِ عیش کی فکرِ فضول سے ملتی ہوئی غروب کی بادِ ملول سے
روتا ہوا سکوتِ لبِ جو لیے ہوئے دوشِ صدا پہ عشق کے آنسو لیے ہوئے
کچھ سرخیٔ شفق میں سیاہی سی آگئی
میداں پر اک اداس خموشی سی چھا گئی
ویرانہ فرطِ درد سے غم ناک ہو گیا اتنے میں کچھ ٹھہر کے پھر آئی وہی صدا

نغمے کی نبضِ سرد مکرّر تپاں ہوئی
گویا ٹھہر کے موج دوبارہ رواں ہوئی

پھر اس کے بعد تیز ہوئی تانِ دفعتہً اللہ رے زور، گونج اٹھا گنبدِ کہن
اور اس کے بعد لحن کا دامن سمٹ گیا
اور یوں صدا کا زور بتدریج گھٹ گیا

گویا سفید، دودھ سی، پتھر کی سیڑھیاں پتلی، سبک، خنک، متناسب، گہر فشاں
تیشے سے زیر و بم کے تراش کر سنور گئیں
ساحل سے تابہ نہر، مچلتی اتر گئیں

۱۹۲۹ء

کلیوں کی بیداری

ہر اک کلی پھول بن رہی ہے، ہر ایک خوشہ چھلک رہا ہے
مچل رہی ہے نسیم بستاں، تمام صحرا مہک رہا ہے

کلاہ نو کج کئے ہوئے ہے ہلال، تاروں کی انجمن میں
کھلا ہوا ہے فلک کا سینہ، زمیں کا غنچہ چٹک رہا ہے

ٹپک رہی ہے گلوں سے شبنم، لچک رہی ہیں ادا سے شاخیں
ہر اک کلی تال دے رہی ہے، ہر ایک طائر چہک رہا ہے

لپیٹے منہ سو رہی تھیں کلیاں، صبا نے آکر جو گدگدایا
سرک گئے ہیں سروں سے آنچل، تمام گلشن مہک رہا ہے

۱۹۲۵ء

بچھڑے ہُوؤں کی یاد!

آ رہی ہے جھُومتی کالی گھٹا مستانہ وار — مست ہے بادل کے پرتو سے کھجوروں کی قطار

سُنبل و نسرین و سرو و یاسمن کے درمیاں — ہو رہی ہیں بادلوں کو دیکھ کر خوش فعلیاں

متّصل ہونٹوں کے جامِ زندگانی آ گیا — رقص میں ہیں ڈوب کے ریشے، کہ پانی آ گیا

لیکن اے یارانِ شہر! اس بدلی کا کیا علاج

ہو رہا ہے ابر کے پرتو سے مجھ کو اختلاج

اُٹھ رہی ہے ہُوک سی پیہم دلِ برباد میں،

آؤ، رو لیں بیٹھ کر، بچھڑے ہوؤں کی یاد میں!

۱۹۲۵ء

فاختہ کی آواز

آج تو فاختہ کی نرم آواز
ہے کچھ اِس طرح غرقِ سوز و گداز

جیسے پیری میں یادِ طفلی آئے
جیسے جل جل کے شمع بجھ بجھ جائے

جیسے یعقوب، غرقِ شیون میں
جیسے سیتا کی جستجو بَن میں

شب کو جس طرح دِل میں درد اُٹھے
بیوگی نوعروس کی جیسے!

شام کو زیرِ سایۂ کہسار
جیسے وادی میں دھیمی دھیمی پھوار

جیسے، جو بر نہ آئی ہو وہ مراد
جیسے بچھڑے ہوؤں کی دل میں یاد

جیسے اشکوں کی لہر سینے میں
پانی آنے لگے سفینے میں

جیسے سسرال میں کوئی لڑکی
دیکھ کر بدلیوں کو ساون کی

صبح، پنگھٹ کی نیم کے نیچے
مائکے کی گھٹائیں یاد کرے

١٩٢٧ء

بُجھا ہُوا دِل

جُھٹپٹے کا وقت ہے آہستہ ہے موجِ ہوا
جھاڑیوں پر اِک سناٹا سا ہے چھایا ہُوا

سامنے پُل، راہ میں اُڑتی ہوئی بھیگی سی خاک
پُل کے نیچے مست چشمے کی صدائے خوابناک

سامنے پامال سا اِک مقبرہ، شاداب گھاس
رات کے قدموں کی آہٹ، شام کی مرطوب سانس

جھاڑیوں پر سُرخیاں، قبروں پہ بوجھل سا غبار
سر بزانو، کوہ و صحرا، آہ بر لب سبزہ زار

گھاس کی خوشبو میں جنگل کی ہوا کا امتزاج
اور ہوا کی موج میں رفتارِ نبضِ اختلاج

سُست ویرانے میں آبادی کی دھیمی سی صدا
خواب جیسے ذہن میں آئے کوئی بھولا ہوا

یا فسوں بھرنے کی خاطر والہانہ سیر میں
کہہ رہا ہو کوئی افسانہ زبانِ غیر میں

کروٹیں سی پے بہ پے دِل میں بدلتا ہے کوئی
سینۂ سوزاں کے ویرانے میں چلتا ہے کوئی

کچھ نہیں کھلتا کہ آخر دِل بجھا جاتا ہے کیوں؟
اور اِس بجھنے کی حالت میں مزا آتا ہے کیوں؟

۱۹۲۸ء

حُور کے اِشارے

بھری برسات میں جس وقت بادل گھر کے آتے ہیں
بجھا کر چاند کی مشعل سیہ پرچم اُڑاتے ہیں

مکاں کے بام و در بجلی کی رَو میں جب جھلکتے ہیں
سُبک بوندوں سے دروازوں کے شیشے جب کھنکتے ہیں

سیاہی اتنی چھا جاتی ہے جب ہستی کی محفل میں
تصوّر تک نہیں رہتا سحر کا رات کے دل میں

اُمنگیں رُوح میں اُٹھتی ہیں جب یادِ الٰہی کی
فضا میں پیچ و خم کھاتی ہیں زُلفیں جب سیاہی کی

ستارے دفن ہو جاتے ہیں جب آغوشِ ظلمت میں
لپک اُٹھتا ہے اِک کوندا سا جب شاعر کی فطرت میں

کڑک سے آنکھ کھُل جاتی ہے جب کمسن حسینوں کی
جھلک اُٹھتی ہے موجِ برق سے افشاں جبینوں کی

ہوائے دلستاں جب راگ ساون کے سُناتی ہے
کسی کافر کی جب رہ رہ کے دل میں یاد آتی ہے

لبِ فطرت جب اتنے متّصل ہوتے ہیں کانوں سے
کہ گونج اُٹھتا ہے دل عشق و محبّت کے فسانوں سے

سِمٹ جاتی ہے جب بجلی، دکھا کر ابر سے جھلکی
فلک پر دفعتہً جب سانس رُک جاتی ہے بادل کی

فلک پر نُور کی جس وقت بنجاتی ہیں تصویریں
شگافِ ابر میں جب کانپنے لگتی ہیں تنویریں

نظر آتے ہیں کچھ شعلے سے جب ظلمت کے دامن میں
شکن بجلی کی جب تبدیل ہو جاتی ہے روزن میں

معاً اِک حُور اُس روزن میں آ کر مسکراتی ہے
اِشاروں سے مجھے اپنی گھٹاؤں میں بلاتی ہے

۱۹۲۵ء

بَن باسی بابُو

جنگلوں کے سرو گوشے ریل بَل کھاتی ہوئی
جہل کے سینے پہ زُلفِ علم لہراتی ہوئی

بزمِ وحشت میں تمدّن ناز فرماتا ہوا
تُند انجن کا دھواں، میداں پہ بَل کھاتا ہوا

فطرتِ خاموش میں بھرتا ہوا سوز و گداز
صنعتِ پُرکار کے چلتے ہوئے جادو کا ناز

الاماں دنیائے نادانی میں دانائی کا زور
بھاپ کی پھُنکار، لوہے کی گرج، پانی کا شور

متّصل جھنکار سے گونجی ہوئی خاموشیاں
پا بگل ویرانیوں میں نغمۂ شہرِ رواں

پھول گھبرائے ہوئے سے، پتّیاں ڈرتی ہوئی
گرم پُرزوں کی صدائیں شوخیاں کرتی ہوئی

ایک اسٹیشن، فسُردہ، مضمحل، تنہا، اُداس
جھٹپٹے کی بدلیاں، پُر ہول جنگل آس پاس

ٹلگجے نالے، اندھیری وادیاں، ہلکی پھوار
بَن کے گرد و پیش کوسوں تک کھجوروں کی قطار

قدِ آدم گھاس، گہری ندّیاں، اُونچے پہاڑ
ایک اسٹیشن فقط لے دے کے، باقی سب اُجاڑ

کاش جا کر بابوؤں سے جوشؔ! یہ پوچھے کوئی
جنگلوں میں کٹ رہی ہے کس طرح سے زندگی؟

پائی تھی کس شہر میں تعلیم؟ رہتے تھے کہاں؟
ساتھ کے کھیلے ہوؤں کا یاد ہے نام و نشاں؟

کِس جگہ طالع ہوئی تھی، نوجوانی کی سحر؟ روز و شب کِن صُحبتوں میں عمر ہوتی تھی بسر؟

رات دِن رہتا تھا جن کی زُلفوں سے دِل کو کام یاد ہیں کیا اب بھی اُن مرتی ہوئی کلیوں کے نام

سچ کہو، اُٹھتے ہیں جب بادل اندھیری رات میں

جب پپیہا کوک اُٹھتا ہے بھری برسات میں

شب کو ہوتا ہے گھنے جنگل میں جب بارش کا زور

سائیاں بھیگی ہوئی راتوں میں جب کرتا ہے شور

رُوح تو اُس وقت فرطِ غم سے گھبراتی نہیں؟

تم کو اپنے عہدِ ماضی کی تو یاد آتی نہیں؟

۱۹۲۷ء

پیش گوئی

جھٹپٹے وقت کا ہے سنّاٹا
ابر چھایا ہوا ہے ہلکا سا،
شام کی تیرگی سے ہیں مدھم
دشت میں رہروؤں کے نقشِ قدم
کس تکلّف سے چل رہی ہے ہوا
جیسے کوئل کی، وادیوں میں صدا
دھیمی دھیمی ہواؤں کا ہے اثر
گھانس کے نرم نرم ریشوں میں
نورِ ظلمت پہ ہو رہا ہے فدا
کیا سلونی ہے جھٹپٹے کی فضا

دیر سے ایک گاؤں کی لڑکی
بھولی، بھالی، حسین چھوٹی سی
عمر ابھی جس کی دس برس کی ہے
ایک لکڑی کے پل پہ بیٹھی ہے
غور سے اک طرف جمائے نظر
رکھّے رخسار کو ہتھیلی پہ
سر پہ آنچل پڑا ہے ساری کا
داہنے ہاتھ میں ہے جس کا سرا
نرم گردن میں خم، کلائی میں بل
ناک میں کیل، آنکھ میں کاجل
رخ پہ زلفیں، نگاہ میں بچپن،
جیسے دھیمی پھوار میں گلشن
رخ پہ موجیں سی زندگانی کی
جھلکیاں طفلی و جوانی کی

کیوں ہیں گم ہوں اُسے نہیں معلوم — یہ فراغت ہے کس قدر معصوم

ڈھیر ہیں زرد زرد پھولوں کے — سامنے جھنڈ ہیں ببولوں کے

شمع سی اک جلائے دیتی ہے — خود بخود مسکرائے دیتی ہے

کوئی دنیا میں کہہ نہیں سکتا! — کیونکہ اس کا شباب گزرے گا

اس کے حالات شیب کیا ہوں گے؟ — ہم تصوّر میں لا نہیں سکتے،

اب بھی کہہ سکتے ہیں مگر اتنا — کہ اُسے جب یہ یاد آئے گا

کہ مرے مائکے کے ویرانے — یوں سناتے تھے شب کو افسانے

کتنی دھومیں مچائی جاتی تھیں — کھیتیاں جب لگائی جاتی تھیں

شام ہوتی تھی کتنی خوش منظر — بیٹھتی تھی میں جا کے جب پل پر

صبح یوں روز مسکراتی تھی — شام اس طرح گنگناتی تھی

ہوک سی اک اٹھے گی سینے میں — دل سے ٹپکیں گی خون کی بوندیں

نہ تو جاگے گی، اور نہ سوئے گی

دیر تک سر جھکا کے روئے گی!

۱۹۲۹ء

بدلی کا چاند

خورشید وہ دیکھو ڈوب گیا، ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب، وہ ہلکے بادل سے، چاندی کے ورق برسانے لگا

وہ سانولے پن پر میداں کے، ہلکی سی صباحت دوڑ چلی
تھوڑا سا ابھر کر بادل سے، وہ چاند جبیں جھلکانے لگا

لو ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل میں وہ خط سے دوڑ گئے
لو، پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں، ظلمت کا قدم تھرّانے لگا

بادل میں چھپا، تو کھول دئیے، بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پہ جو آیا، تو گردوں، دریا کی طرح لہرانے لگا

سمٹی جو گھٹا، تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
تنگی جو ہوا، تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

غرفوں سے جھانکا گردوں کے، امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے، کہسار کا سر چکرانے لگا

پردہ جو اُٹھایا بادل کا، دریا پہ تبسّم دَوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی میدان کا دل گھبرانے لگا

اُبھرا تو تجلّی دوڑ گئی، ڈوبا تو فلک بے نُور ہُوا
اُلجھا، تو سیاہی دَوڑا دی، سُلجھا تو ضیا برسانے لگا

کیا کاوشِ نور و ظلمت ہے کیا قید ہے کیا آزادی ہے
انساں کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

سنہ ۱۹۳۰ء

موجِ عرفاں

ہوائے سرد سے سرشار ہے یمین و یسار
فضائے چرخ پہ چھایا ہوا ہے ابرِ بہار

کھڑا ہوا ہوں میں خاموش اک پہاڑی پر
مچل رہی ہے تمنّا کہ پڑ رہی ہے پھوار

غرورِ اہلِ دول جیسے چشمِ شاعر میں
پہاڑیوں سے نظر آ رہے ہیں یُوں غبار

نہیں چمکتی ہے رہ رہ کے ابر میں بجلی
تڑپ رہی ہے یہ تھم تھم کے روحِ ابرِ بہار

بلند و پست چمکتی ہوئی چٹانوں پر
کھنک رہی ہیں یہ بوندیں کہ بج رہا ہے ستار

ہوائے نم کے تھپیڑے ارے معاذ اللہ!
دماغ گنگ ہے اور ہو رہا ہے دل بیدار

بساطِ منظرِ ہستی لپٹتی جاتی ہے
کہ اُٹھ رہا ہے بتدریج پردۂ اسرار

زباں ہو جن کے تصوّر سے رعشہ بر اندام
تڑپ رہے ہیں مناظر میں وہ لطیف اشعار

بس اے ندیم! کچھ اب جوشؔ کہہ نہیں سکتا
کہ حسنِ شاہدِ معنی سے ہے نگاہ دوچار

۱۹۲۷ء

گاتی ہوئی راہیں

چھاؤں میں تاروں کی ملتی ہیں مجھے گاتی ہوئی
راہیں، کھیتوں کے کنارے پیچ و خم کھاتی ہوئی

کوہ و صحرا کو سناتی ہیں حدیثِ رنگ و بو
پتلی پتلی ٹہنیوں پر قمریاں گاتی ہوئی

اوس میں ڈوبی ہوئی چلتی ہے متوالی ہوا
کنج میں چھپتی ہوئی، غنچوں کو چٹکاتی ہوئی

پھوٹتی ہے عشوۂ ترکانہ سے پہلی کرن
نبضِ خار و خس میں خونِ گرم دوڑاتی ہوئی

چرخ سے آتی ہے رہ رہ کر صدا "روشن نگاہ"
خواب سے اٹھتی ہیں کلیاں ناز فرماتی ہوئی

پھوٹتی ہے یوں کرن جیسے کوئی کمسن عروس
آرہی ہو کھیلتی کنگن سے شرماتی ہوئی

۱۹۲۳ء

دُعائے سحری

علی الصّباح کہ سنولا چلا تھا چہرۂ ماہ
بساطِ ارض و فضائے سما تھی نرم و رقیق
رواقِ منظرِ گُل تھا نشیمنِ فردوس
جبینِ ذرّۂ خاکی تھی جلوہ گاہِ عقیق
صبا کے رقص میں تھا لحنِ مُطربانِ چمن
چمن کے صحن میں تھی بوئے دوستانِ رفیق
اُفق پہ ساقیٔ فطرت کی جاں فروز شراب
چمن میں لالۂ احمر کا زر فشاں ابریق
صدائے نَے سے پریشاں تھے شبروانِ جہاں
لوائے مہر سے لرزاں تھے قاطعانِ طریق
تجلیّات میں تھی دفن، شورشِ حکمت
تخیّلات میں تھا مُردہ فتنۂ تحقیق

ہجومِ نور سے سوزاں تھا دیدۂ تکذیب
نسیمِ صبح سے روشن تھی مشعلِ تصدیق
بلند و پست کا ہر زیر و بم تھا ہم آہنگ
حیات و موت کے ہر مسئلے میں تھی تطبیق!
تڑپ رہی تھی فضاؤں پہ کاوشِ ایجاد
رواں دواں تھا ہواؤں میں جذبۂ تخلیق
فلک کے دوش پہ غلطیدہ تھے رموزِ خفی
صبا کی موج میں رقصاں تھے نکتہ ہائے دقیق
یہ رنگ دیکھ کے بے ساختہ پکارا دل
کہ کاش جلوۂ جاناں میں ہو نہ اب تعویق
نزاکتِ دلِ اہلِ جنوں کا پاس کریں
بتانِ زہرہ جبیں کو خدا یہ دے توفیق!

سنہ ۱۹۲۴ء

گرمی اور دیہاتی بازار

دوپہر، بازار کا دِن، گاؤں کی خلقت کا شور
خُون کی پیاسی شعاعیں، رُوح فرسا لُو کا زور
آگ کی رَو، کاروبارِ زندگی کا پیچ و تاب
تُند شُعلے، سُرخ ذرّے، گرم جھونکے، آفتاب
شور، ہلچل، غلغلہ، ہیجان، لُو، گرمی، غبار
بَیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں، قطار اندر قطار
مکھیوں کی بِھنبھناہٹ، گُڑ کی بُو، مرچوں کی دھانس
خُربزے، آلو، کھلی، گیہوں، کدُو، تربُوز، گھانس
دُھوپ کی شِدّت، ہوا کی یُورشیں، گرمی کی رَو
کملیوں پر سُرخ چاول، ٹاٹ کے ٹکڑوں پہ جَو
گرم ذرّوں کے شدائد، جھکّڑوں کی سختیاں

جھگڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی چلموں کا دُھواں
ماؤں کے کاندھوں پہ بچّے گردنیں ڈالے ہوئے
بھوک کی آنکھوں کے تارے پیاس کے پالے ہوئے
بام و در لرزے ہوئے خورشید کے آفات سے
ہر نفس اک آنچ سی اُٹھتی ہوئی ذرّات سے
مرد و زن گردش میں چیلوں کی صدا سنتے ہوئے
چلچلاتی دھوپ کی رَو میں چنے بھنتے ہوئے
میان سے موسم کی تیغِ بے اماں نکلی ہوئی
پیاس سے انسان و حیواں کی زباں نکلی ہوئی
لُو کے مارے بام و در کی رُوح گھبرائی ہوئی
دوستوں کی شکل پر بیگانگی چھائی ہوئی
یُوں شعاعیں سایۂ اشجار سے چھنتی ہوئی
بے مروّت کی سپاٹ آنکھوں کی جیسے روشنی
آسماں پر اَبر کے بھٹکے ہوئے ٹکڑوں کا رَم
نشے میں ممسک کا جیسے وعدۂ جُود و کرم
ہر روش پر چڑچڑا پن ہر صدا میں بے رُخی

|٦|

ہر جگہ، بُھنتا ہوا، ہر کھوپڑی پکتی ہوئی

سر پہ کافر دھوپ، جیسے رُوح پر عکسِ گناہ

تیز کرنیں، جیسے بُوڑھے سودخواروں کی نگاہ

۱۹۳۶

"اِکتارے" کا جادو

بَرق پرورِ زندگی وابستۂ صد پیچ و تاب — اَبر کی باریک چادر، دوپہر کا آفتاب

حاشیے پر شہر کے، اِک باغ، ویران و تباہ — باغ کے دامن میں اِک اُجڑی ہوئی سی شاہراہ

گامزن اُس راستے پر ایک پیرِ ناتواں — ہات میں "اکتارہ" لب پر راگنی کی سِسکیاں

تُندرَو جھونکوں کے شانے پر حرارت کا دباؤ — جن میں "اِکتارے" کی آواز دل کا بے پروا بہاؤ

لرزشوں سے تار کی پھیلی فضا میں اِک کسک — ابتدائے عشق میں جس طرح نبضوں کی دھمک

دے تو دوں تشبیہ لیکن کِس کو آئے گا یقیں — آنسوؤں کی راگنی سے انجمن واقف نہیں

اِس مزے کے ساتھ جاں افروز تانیں مُضمحِل — کروٹیں سینے میں لے جس کرب سے شاعر کا دِل

یُوں لرزتے ساز کے بے چین نغمے دلنشیں — پینگ لے جِس طرح کوئی فِتنۂ دنیا و دیں

اَنتر دل میں جھُٹپٹے کے وقت کی سی آب جُو — زیر و بم کے لوچ میں رفتارِ نبضِ آرزو

راگنی کی نرم لہریں، جاگتی سوتی ہوئی — بہہ رہی ہیں پردہ ہائے دِل سے مَس ہوتی ہوئی

ذرّہ ذرّہ اِک نئے سانچے میں ڈھلنے کے قریب
عالمِ اسباب ہے گویا پگھلنے کے قریب

۱۹۴۸ء

رقیب فرشتے

صبح کے تارے سے تھی گلرنگ گردوں کی جبیں
مست تھی موجِ صبا، کلیاں ابھی چٹکی نہ تھیں
آسماں پر کیف طاری تھا، زمیں پر بے خودی
جُھک چلا تھا چاند، پھیکی پڑ چلی تھی چاندنی
ایک ہلکا سا تبسّم تھا در و دیوار پر!
جیسے میٹھی نیند کا جادو رُخِ گلنار پر
گِر رہے تھے گنبدِ افلاک سے بے اختیار
خاک پر سیّال چاندی کے ہزاروں آبشار
آ رہی تھی نرم قدموں سے نسیمِ دل نواز
سرنگوں تھے بوستاں، کلیاں تھیں محوِ خوابِ ناز
صُبح کے چہرے پہ تھی ہلکے دھندلکے کی نقاب
گا رہا تھا بھیرویں، میٹھے سُروں میں ماہتاب
آ رہی تھی آسمانوں سے فرشتوں کی صدا کیا سُہانا وقت ہے صلِّ علیٰ صلِّ علےٰ

اِن صداؤں سے مگر میں کھا رہا تھا پیچ و تاب
اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اُبھرا آفتاب
شکر کے سجدے کئے میں نے اک دشمن بہہ گئے
خیریت گزری، کہ قصے بڑھتے بڑھتے رہ گئے
میری معشوقہ پہ یہ بے عقل مرنے آئے تھے
کیا سمجھ کر صبح کی تعریف کرنے آئے تھے
میں تھا جب موجود پھر یہ گانے والے کون تھے؟ میری سرحد میں فرشتے آنے والے کون تھے

۱۹۲۹ء

آثارِ جمال

ابر کے ٹکڑے نہیں، سبزہ کی زیبائی؟ نہیں
وہ مناظر، خوش ہو جس سے عام بینائی؟ نہیں
خشک، چٹیل، کھردرا میدان، تا حدِّ نگاہ
سرد، محزوں، مضمحل، لب خشک، بے رونق، تباہ
ہر طرف اِک منظرِ افسردگی، کلیاں، نہ پھول
چند سوکھی جھاڑیاں، اِک آدھ بے پروا ببول
جابجا اُجڑے ہوئے پامال کھیتوں کے نشاں
کھپ چکی ہیں عارضِ عالم میں جن کی سرخیاں
خون تھا جن کا نقوشِ مدّعا کے واسطے
مٹ چکے تھے جو تمدّن کی بقا کے واسطے
گاؤں کے شیشوں سے اُڑ کر جن کے جلوؤں کی شراب
بن چکی ہے دخترانِ شہر کے چہروں پہ آب
ہو چکی ہیں ختم گو اس خاک کی رنگینیاں
چشمِ شاعر پہ مگر اب بھی ہیں کچھ جلوے عیاں

اب بھی غلطاں ہے یہاں دیکھ لے نگاہ نکتہ یاب

پھول چننے والیوں کا تُند، متوالا شباب

گیت کھیتوں کی منڈیر پر دل پہ کبھی گائے ہوئے

پھر رہے ہیں صحن خاموشی میں گھبرائے ہوئے

جذب ہے اِس خار و خس میں موسمِ گُل کا گداز

دفن اِن ذرّوں میں ہیں نو خیز جذبوں کے راز

کتنی تانوں کے یہاں منڈلا رہے ہیں زیر و بم

سو رہے ہیں کس قدر اِس خاک میں نقشِ قدم

دُختران دشت کی رنگینیاں ہیں جلوہ گر

کھیتیوں کے آنکھ جھپکاتے ہوئے آثار پر

اِس فضا میں اَبر کی ہے جس کو یاد آئی ہوئی

پھر رہی ہے غنچگی کی رُوح گھبرائی ہوئی

رنگ و بُو ہے عہدِ رنگیں کے گزر جانے کے بعد کہہ رہے ہیں خار و خس افسانہ افسانے کے بعد

۱۹۲۵ء

ذی حیات مناظر

خامشی دشت پہ جس وقت کہ چھا جاتی ہے
عمر بھر جو نہ سُنی ہو وہ صدا آتی ہے

بھینی بھینی سی مچلتی ہے فضا میں خوشبو
ٹھنڈی ٹھنڈی لبِ ساحل سے ہوا آتی ہے

دشتِ خاموش کی اُجڑی ہوئی راہوں سے مجھے
جادہ پیماؤں کے قدموں کی صدا آتی ہے

پاس آ کر مرے گاتی ہے کوئی زُہرہ جمال
اور گاتی ہوئی پھر دُور نکل جاتی ہے

آنکھ اُٹھاتا ہوں تو خوش چشم نظر آتے ہیں
سانس لیتا ہوں تو احباب کی بُو آتی ہے

دشنہ رکھ دیتا ہے گھبرا کے رگِ جاں پہ کوئی
جب کلی خاک پہ دم توڑ کے گر جاتی ہے

مسکراتی ہے جو رہ رہ کے گھٹا میں بجلی
آنکھ سی کوہ بیاباں کی جھپک جاتی ہے

کرنے لگتے ہیں نظارے سی جو با دلِ مایوس
برق آہستہ سے کچھ کان میں کہہ جاتی ہے

جھاڑیوں کو جو ہلاتے ہیں ہوا کے جھونکے
دلِ شبنم کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

مجھ سے کرتے ہیں گھنے باغ کے سائے باتیں
ایسی باتیں کہ مری جان پہ بن جاتی ہے

گنگناتے ہوئے میدان کے سنّاٹے میں
آپ ہی آپ طبیعت مری بھر آتی ہے

یوں نباتات کو چھوتی ہوئی آتی ہے ہوا
دِل میں ہر سانس سے اک پھانس سی چُبھ جاتی ہے

جب ہری دُوب کے مُڑ جاتے ہیں نازک ریشے　　شیشۂ قلب میں اِک ٹھیس سی لگ جاتی ہے
بانسری جیسے بجاتا ہو کہیں دُور کوئی　　یُوں دبے پاؤں بیاباں سے ہوا آتی ہے
حسرتیں خاک کی غنچوں سے اُبل پڑتی ہیں　　رُوح میدان کی پھولوں سے نکل آتی ہے
طبعِ شاعر کو، روانی کا اشارہ کر کے　　نہر شاخوں کے گھنے سائے میں سو جاتی ہے

اِن مناظر کو میں بے جان سمجھ لُوں کیوں کر؟
جوشؔ! کچھ عقل میں یہ بات نہیں آتی ہے

گھٹا

اٹھی گھٹا، وہ رنگ و بو کا کارواں لئے ہوئے
جلو میں کائنات کی جوانیاں لئے ہوئے

لئے ہوئے پیامِ جاں ہر ایک رس کی بوند میں
ہر ایک رس کی بوند میں پیامِ جاں لئے ہوئے

لئے ہوئے ہوا کے نرم بازوؤں پہ بوستاں
ہوا کے نرم بازوؤں پہ بوستاں لئے ہوئے

دھواں دھواں لئے ہوئے بلندیوں پہ چرخ کی
بلندیوں پہ چرخ کی دھواں دھواں لئے ہوئے

زبانِ تشنہ کام کی جماہیوں کے سامنے
شرابِ لالہ رنگ کی گلابیاں لئے ہوئے

ہزار سوز و ساز میں ہجومِ پیچ و تاب سے
رنگین و نرم دامنوں میں بجلیاں لئے ہوئے

ہر ایک سو رواں دواں کبھی یہاں کبھی وہاں
بنانِ شوخ و شنگ کی سی شوخیاں لئے ہوئے

صدائے برق و رعد میں، ہوائے تند و تیز میں
نزاعِ عشق و ہوش کی کہانیاں لئے ہوئے

ہوائیں اُڑتی ہوئی فضا میں جھومتی ہوئی
تحمل و شکیب کی تباہیاں لئے ہوئے

شکستِ حسن و عشق کو، جہانِ رقص و کیف کو
فضائے آب و رنگ میں کشاں کشاں لئے ہوئے

حریمِ کیف و سرخوشی میں، پردہ ہائے رنگ میں
سبو بدوش غنچوں کی مستیاں لئے ہوئے

ادائے ناز و دلبری کی رنگ ریز چھاؤں میں
نئی نئی جوانیوں کی جھلکیاں لئے ہوئے

لئے ہوئے ہواؤں پہ سیاہ و سرخ کشتیاں — ہوائے تند کشتیوں کے بادباں لئے ہوئے

لئے ہوئے بلندیوں پہ ولولے حیات کے — حیات بخش ولولے بلندیاں لئے ہوئے

سیاہیوں کے سلسلے ہیں تیرگی کی موج میں — جنوں فروش کاکلوں کی داستاں لئے ہوئے

کدھر ہے جوشؔ! بدلیاں رواں ہیں سوئے میکدہ

سیاہیوں کے حاشیے پہ سرخیاں لئے ہوئے

سنہ ۱۹۳۱ء

موہوم آواز

فلک پر رات کو چھائی ہوئی تھیں بدلیاں ہمدم
ہوا نمناک تھی، میداں تھا غمگیں، چاندنی مدھم
مہِ تاباں کی کشتی آسماں تھم تھم کے کھیتا تھا
ہجومِ درد سے رُک رُک کے میداں سانس لیتا تھا
گھٹائیں چاند کو پیہم جلاتی تھیں، بجھاتی تھیں
تمنّاؤں کی شمعیں طاقِ دل میں جھلملاتی تھیں
بَلا کی الجھنیں تھیں، مضمحل میدان پر طاری
تجلّی سے کبھی ہلکا، سیاہی سے کبھی بھاری
رواں مشرق سے مغرب کی طرف اُڑتے ہوئے بادل
ہوا کی سنسناہٹ، دل کی جنبش، چاند کی ہلچل!
ہجومِ تیرگی سے تھی وہ حالت ماہِ پرویں کی
رُخِ رنگیں پہ جیسے جھلکیاں سی خوابِ نوشیں کی

گھٹاؤں میں ٹھٹھرائے ہوئے یُوں چاند کے شوشے
دلِ نو رُبہ شکن میں، ذوقِ استغفار ہو جیسے
نظر آتا تھا گھبرایا ہوُا، یُوں چاند، بادل میں
کوئی سہمی ہوئی دوشیزہ جیسے شب کو جنگل میں
ہجومِ ابر سے مجروح تھی یُوں چاند کی شوخی
کہ جیسے عظمتِ شاعر کے حق میں زندگی اُس کی
گھٹائیں، اور گھٹاؤں کے شگافوں سے صنم کاری
طلسم نیند کا اور نیند میں ہلکی سی بیداری
تگ و دو کا ہوُا، جب حکم دیتی تھی اشاروں سے
گھٹا شانہ لڑا دیتی تھی جھُک کر کوہساروں سے
جنوں انگیز و نامعلوم، اِن لمحوں کی طغیانی
نہ پوچھ، اے ہم نشیں! اُس وقت کی آشفتہ سامانی
قیامت خیز سنّاٹا، کسی کا نام لیتا تھا   کوئی رہ رہ کے دل کو دُور سے آواز دیتا تھا

۱۹۲۶ء

جذباتِ فطرت

پہاڑ کی صدا

مری وادی میں ہے پھولوں کی دُنیا

اُبلتا ہے مرے پہلو سے چشما

مرے دامن میں ہے شفّاف دریا

مری چوٹی پہ قدرت کا تماشا

اِدھر آ، اے مرے شاعر اِدھر آ

دریا کی صدا

مری لہروں میں بجلی کا خزانہ

مری رَو میں محبّت کا فسانہ

مرے دھارے میں عظمت کا ترانہ

مرے گرداب میں چنگ و چغانہ

اِدھر آ، اے مرے شاعر اِدھر آ

طلوعِ سحر کی صدا

مرے آئینہ میں تصویرِ جاناں
مرے دربار میں حوریں غزل خواں
مرے رخسار میں انوارِ ایماں
مرے اوراق میں اسرارِ عرفاں
اِدھر آ اے مرے شاعر اِدھر آ

غروبِ آفتاب کی صدا

مری تاریکیوں میں یاس و حرماں
گدازِ دل کے مجھ میں ساز و ساماں
مری سرخی میں سوزِ برقِ پنہاں
خموشی سے مری سنسان میداں
اِدھر آ اے مرے شاعر اِدھر آ

ستارۂ سحری کی صدا

پُجاری ہیں مرے "فطرت" کے عاشق
مری ضَو، وقتِ نازک کے مطابق
مرا ہلکا سا پرتو، جانِ مشرق
حَسیں مجھ سے جبینِ صُبحِ صادق
اِدھر آ، اے مرے شاعر اِدھر آ

شفق کی صَدا

مرے عارِض میں کُندن کی دمک ہے
مری چادر میں کوندے کی لپک ہے
مرے سینے میں عرفاں کی جھلک ہے
مرے آغوش میں تاجِ فلک ہے
اِدھر آ، اے مرے شاعر اِدھر آ

چاند کی صدا

زمیں و آسماں مجھ سے منوّر
بچھی ہے نُور کی ہلکی سی چادر
خُنک مجھ سے گُل اندامون کے بستر
مری ضَو سے جھلکتا ہے سمندر
اِدھر آ اے مرے شاعر اِدھر آ

آفتاب کی صدا

فلک پر دائرہ میرا مزیّن
سحر کے ہاتھ میں سونے کا کنگن
کرن میری نگاہِ شوق و پُرفن
مرے آتے ہی جاگ اُٹھتے ہیں گُلشن
اِدھر آ، اے مرے شاعر اِدھر آ

آدھی رات کی صدا

مرے تاروں کی گردش سازِ عشرت
مری خاموشیوں میں عقل و حکمت
تصوّرِ دوست کا ہے میری بدولت
قلمرو سے مری خارج ہے محنت
اِدھر آ، اے مرے شاعر اِدھر آ

فصلِ گُل کی صدا

مری محفل میں بُلبُل کا ترانہ
دِلوں کی زندگی، میرا فسانہ
ہوائیں میری، خوشبو کا خزانہ
محبّت خیز ہے میرا زمانہ
اِدھر آ، اے مرے شاعر اِدھر آ

سمندر کی صدا

مری موجوں میں مُضطر رُوحِ طوفاں
مرے سینے میں جوشِ ابرِ باراں
مری تہ میں ہزاروں رازِ پنہاں
مری تشریح میں ہر عقل حیراں،
اِدھر آ، اے مرے شاعر اِدھر آ

پھُول کی صدا

چمن کا حُسن ہُوں گلشن کا زیور
مرا عاشق ہے جوشِ رُوح پرور
مری ہر پنکھڑی نرم و معطّر
مرے کانوں میں ہیں شبنم کے گوہر
اِدھر آ، اے مرے شاعر اِدھر آ

گریۂ مسرّت

آج ٹوٹا کے، الحفیظ والاماں — دوستو! عثمان ساگر[1] کا سماں

دیدنی تھی نرم پودوں کی لچک — بدلیاں چھائی ہوئی تھیں دُور تک

ظلمتیں تھیں نُور سے گرمِ ستیز — ولولوں پر تھی ہوائے تند و تیز

سامنے تھیں پتّھروں کی حسرتیں — نرم و نازک جھاڑیوں کی شکل میں

جزر و مد میں تھی بفرطِ اضطراب — ساغرِ عثمان ساگر کی شراب

رُوحِ طوفاں در بغل، کف در دہاں — لو سنو، کس طرح تھیں موجیں رواں

جھاگ اُڑاتی، پھاندتی، اُٹھتی ہوئی — کپکپاتی، لوٹتی، مُڑتی ہوئی

چُلبلی، اُبھری ہوئی، نکھری ہوئی — چیختی، سر پھوڑتی، بپھری ہوئی

بجلیاں دامن میں چمکاتی ہوئی — دمبدم آتی ہوئی، جاتی ہوئی

اِس طرف سے اُس طرف ہوتی ہوئی — پتّھروں کو چھانٹتی، دھوتی ہوئی

گرتی پڑتی، مست، سر دھنتی ہوئی — مرتعش قالین سا بُنتی ہوئی

زیر و بم کا تار دکھلاتی ہوئی — اُٹھ کے بڑھتی، گر کے چکراتی ہوئی

---

[1] حیدر آباد کا ایک روح پرور تالاب ۱۲۔

گنگناتی، صف بہ صف آتی ہوئی — لڑتی، بھڑتی، گونجتی، گاتی ہوئی
مچھلیوں کو درسِ غم دیتی ہوئی — ہچکیوں پہ ہچکیاں لیتی ہوئی
ساحلِ رنگیں سے ٹکراتی ہوئی — اینڈتی، اٹھلاتی، بل کھاتی ہوئی
دمبدم سنتی ہوئی، روتی ہوئی — ملتی، کتراتی، جدا ہوتی ہوئی
جابجا دلدل میں کاجل پارتی — چوکڑی بھرتی چھلانگیں مارتی
پے بہ پے غاروں کے اندر گھومتی — ناچتی، حلقے بناتی، جھومتی
بلبلاتی، بھاگتی، منہ موڑتی — مڑکے پھر ساحل پہ موتی توڑتی
گاتی، لہراتی، گرجتی، ہانپتی — دوڑتی، بڑھتی، سمٹتی، کانپتی

تو کہے دریا میں تھا غرقِ نمو
یار کی کھڑیل جوانی کا لہو

یہ سماں تھا، اور اک رنگیں پرند — رُوحِ شاعر کی طرح بے قید و بند
بے خودی کے جام چھلکاتا ہوا — گزرا میرے پاس سے گاتا ہوا

نغمہ سُن کر اِس قدر جی خوش ہوا
ہچکیاں لے لے کے میں رونے لگا

۱۹۳۲ء

اسلامیات

کفرے چو منے گزاف آساں نہ شود — محکم تر از ایمانِ من ایماں نہ شود

در دہر چو من یکے و آں ہم کافر — پس در دو جہاں یکے مسلماں نہ شود

(یہ تمام نظمیں ۱۹۲۷ء تک کی ہیں)

ہاں خُود و زِرہ بھی تو ہے اِسلام کا زیور
باندھے گا فقط جامۂ احرام کہاں تک

(جوشؔ)

اَے خُدا

اے خُدا! سینۂ مسلم کو عطا ہو وہ گدازْ تھا کبھی حمزہؓ و حیدرؓ کا جو سرمایۂ نازْ
پھر فضا میں تری تکبیر کی گونجے آوازْ پھر اِسی انجام کو دے گرمیٔ رُوحِ آغازْ

نقشِ اسلام اُبھر جائے، جلی ہو جائے
ہر مسلمان حسینؑ ابنِ علی ہو جائے

دشتِ اِسلام کے کانٹوں کو گلستاں کر دے پھر ہمیں شیفتۂ جلوۂ ایماں کر دے
دل میں پیدا تپشِ بوذر و سلماں کر دے اپنے محبُوب کی سوگندؐ مسلماں کر دے

رُوکشِ صبح، شبِ تار کا سینہ ہو جائے
آبگینے کو وہ چمکا کہ نگینہ ہو جائے

دے ہمیں بارِ خُدا! جراَت و ہمّت کے صفات دل کو یوں چھیڑ کہ پھر جاگ اُٹھیں احساسات
پھر سے ہوں تازہ رسُولِ عربی کے غزوات درس مومن کو یہ دے موت ہے تکمیلِ حیات

جادہ پیماؤں کو چھوٹا ہوا صحرا دیدے
قیس کو پھر خلشِ ناقۂ لیلےٰ دے دے

پھر بہار آئے، مئے ناب پری ہو جائے — پھر جہاں محشرِ صد جلوہ گری ہو جائے
دے وہ چھینٹے کہ ہر اک شاخ ہری ہو جائے — زورِ آندھی کا نسیمِ سحری ہو جائے
طبعِ افسردہ کو پھر ذوقِ روانی دیدے
اس زلیخا کو بھی معبود جوانی دیدے

ہم کو سمجھا کہ تلاطم میں ٹھہرنا کیسا؟ — نشۂ بادۂ جرأت کا اترنا کیسا؟
موت کیا شے ہے بھلا موت سے ڈرنا کیسا؟ — کوئی اس راہ میں مرنا بھی ہے، مرنا کیسا؟
مر کے بھی خون میں یوں موجِ بقا آتی ہے
کہ اجل سامنے آتے ہوئے شرماتی ہے

صبحِ اسلام پہ ہے تیرہ شبی کا پرتو — لبِ مسلم سے ہٹا تشنہ لبی کا پرتو
کاش پھر ماند ہو راحت طلبی کا پرتو — ڈال سینوں میں رسولِ عربی کا پرتو
غُل ہو وہ حوصلۂ شوق دوبارہ نکلا
وہ چمکتا ہوا اسلام کا تارہ نکلا

زندہ کس طور سے رہتے ہیں بتا دے ہم کو — عقلِ حیراں ہو وہ دیوانہ بنا دے ہم کو
سوئے میخانۂ توحید صدا دے ہم کو — عشق کا ساغرِ لبریز پلا دے ہم کو
کج ہوں اُس وقت سرِ شیشہ کلاہیں اپنی
جب ملیں ساقیٔ کوثر سے نگاہیں اپنی

ذاکر[1] سے خطاب

ہوشیار اے ذاکرِ افسردہ فطرت! ہوشیار — مردِ حق اندیشہ اور باطل سے ہو زار و نزار

ضعف کا احساس اور مومن کو، یہ کیا خلفشار — لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیؓ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار

جو حسینی ہے، کسی قوت سے ڈر سکتا نہیں

موت سے ٹکرا کے بھی سا ونت مر سکتا نہیں

تو نہیں روحِ شہیدِ کربلا سے بہرہ مند — تیرے شانوں پہ تو زلفِ بزدلی کی ہے کمند

سخت استعجاب ہے اے پیشہ ور ماتم پسند — پیروِ ضیغم کے سینے میں ہو قلبِ گوسفند

---

[1] "ذاکر" بدبخت اور غلام ہندوستان کا، جو خود اپنی وسعت سے برباد اور اپنے ہی بوجھ کے نیچے کچلا ہوا ہے، ایک ایسا سست رگ اور زہریلی فطرت فرد ہے، جو (۱) واقعاتِ کربلا کو صحت و عدمِ صحت سے بے نیاز ہو کر اور روحِ شہادتِ امام سے بیگانہ رہتے ہوئے ماہِ محرم کی مجلسوں میں محض اس لئے بیان کرتا ہے کہ سامعین روتے روتے بیہوش ہو جائیں۔

(۲) اس شدت کے ساتھ رلانے کی اچھی طرح مول تول کر کے فیس بھی لیتا ہے۔

(۳) فیس کے ساتھ ساتھ "انعام" و "تحائف" کے واسطے بھی غیر ملفوظ طور سے مُصر ہوتا ہے۔

(۴) اس ناجائز فیس اور ان ناروا تحائف کو شرمناک جمود اور عبرت انگیز بے حسی کے ساتھ اپنے ہی نفس کی خاطر دوسرے محرم تک صرف کرتا رہتا ہے۔

(۵) ملّت کو بیدار کرنے کے عوض تھپکتا اور لوریاں دیتا ہے اور فاتح و جنگجو بنانے کے بدلے بزدل و مظلوم بنانے کی سعی میں سرگرم رہتا ہے۔

(۶) شہیدِ اعظم کی قربانی کے مغز اور روح کو خلقت کی نظروں سے بصد ہزار اہتمام مخفی رکھتا ہے۔

(۷) حق کی طرف ملتفت نہیں ہوتا اور باطل سے بے حد ڈرتا ہے۔

(۸) اور اپنے ان خدمات کا صلہ پانے کے لئے آستانِ حکومت پر بھی ناصیہ فرسائی کرتا ہوا دیکھا جاتا ہے۔

ننگ کا موجب ہے یہ اہلِ دغا کے واسطے
یُوں نہ ماتم کر شہیدِ کربلا کے واسطے

مانعِ شیون نہیں میرا پیامِ مستقل — گریہ فطری شے ہے دشمن پر بھی بھر آتا ہے دِل
دِل نہیں پتھر ہے مولیٰ پر نہ ہو جو مضمحل — گریۂ مومن سے ہے تزئینِ بزمِ آب و گِل
کون کہتا ہے کہ دل کے حق میں غم اچھا نہیں
پھر بھی شغلِ گریہ نصب العین بن سکتا نہیں

ہاں میں واقف ہوں کہ آنسو ہے وہ تیغِ آبدار — سنگ و آہن میں اُتر جاتی ہے جس کی نرم دھار
ہے مگر مردانگی کو اُن خُنک اشکوں سے عار — جن کے شیشوں میں نہ غلطاں ہوں شجاعت کے شرار
اشکِ بے سوزِ دروں پانی ہے ایماں کی قسم
قلبِ شبنم پر شعاعِ مہرِ تاباں کی قسم

سوچ تو اے ذاکرِ افسردہ طبع و نرم خُو — آہ تو نیلام کرتا ہے شہیدوں کا لہو
تاجرانہ مشق ہے مجلس میں تیری ہاؤ ہو — فیس کا دریوزہ ہے منبر پہ تیری گفتگو
عالمِ اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہے تُو
خُونِ اہلِ بیت میں لقمے کو تر کرتا ہے تُو

حرص نے تجھ کو سکھایا ہے دنائت کا سبق — کربلا کے ذکر میں لیتا نہیں کیوں نامِ حق
چشمۂ دولت ہے تیرا سیلِ اشکِ بے قلق — خُون کی چادر سے سونے کے بناتا ہے ورق

خانۂ برباد ہے دولت سرا تیرے لئے

اک دفینہ ہے زمینِ کربلا تیرے لئے

کیا بتاؤں، کیا تصوّر تُو نے پیدا کر دیا — غیرتِ حق کو بھلا کر، حق کو رسوا کر دیا

کربلا، وخونِ مومن کو تماشا کر دیا — "آبِ رکنا باد" دبستانِ "مصلّے" کر دیا

مشقِ گریہ عیش کی تمہید ہے تیرے لئے

عشرۂ ماہِ محرم، عید ہے تیرے لئے

سوچ تو کچھ جی میں اے مشتاقِ راہِ مستقیم — مومنوں کے دل ہوں اور درماندۂ اُمید و بیم

شدّتِ آہ و بکا سے دل ہو سینوں میں دو نیم — کیوں یہی لے دے کے تھا کیا مقصدِ ذبحِ عظیم؟

خوف ہے قربانیٔ اعظم نظر سے گر نہ جائے

ابنِ حیدر کے لہو پر، دیکھ، پانی پھر نہ جائے

سازِ عشرت ہے تجھے ذکرِ امامِ مشرقین — ڈھالتا ہے تیرے سکّے بستگانِ غم کا بین

تیری دارالضرب ہے اہلِ عزا کا شور و شین — سر جھکا لے شرم سے اے تاجرِ خونِ حسینؑ

ذہن میں آتا ہو جس کا نام تلواروں کے ساتھ

اُس کا ماتم اور ہو سکّوں کی جھنکاروں کے ساتھ

غم کے سکّے پھر زرِ نا کے بٹھائے جائینگے؟ — کب تک آخر ہم پہ عشرت مُرلائے جائینگے؟

دام پر تا جبند لیوں والے گرائے جائینگے؟ — آنسوؤں سے تا کجا "موتی" بنائے جائینگے؟

پھر لقمۂ تا بہ کے منبر پہ منہ کھولے گا تو؟
تا کجا پانی کے کانٹے پر لہو تولے گا تو؟

کربلا میں اور تجھ میں اِتنا بُعد المشرقین — اُس طرف شورِ رجز خوانی، اِدھر دیکھے بکین
اُس طرف تکبیر، اِدھر ہنگامہائے شور و شین — اِس طرف اشکوں کا پانی، اُس طرف خونِ حسینؑ
وہ تجھے کس منزل میں اور تو کونسی منزل میں ہے
شرم سے گڑ جا اگر احساس تیرے دل میں ہے

کربلا سے واقفیت بھی ہے سرد و منفعل؟ — کربلا در پردہ بشاش اور بظاہر مضمحل؟
جس کی رفعت سے بلندی آسمانوں کی خجل؟ — جس کے ذرّوں میں دھڑکتے ہیں جگر والوں کے دل
خندہ زن ہے جس کی رفعت گنبدِ افلاک پر
مُہرِ تکمیلِ نبوّت ثبت ہے جس خاک پر

جس کے ہر ذرّے میں غلطاں ہیں ہزاروں آفتاب — خار کی نبضوں میں جاری ہے جہاں خونِ گلاب
جس کے خار و خس میں ہے خوشبوئے آلِ بوتراب — کربلا! تاریخِ عالم میں نہیں تیرا جواب
کربلا! تو آج بھی قائم ہے اپنی بات پر
مہراب بھی سجدہ کرتا ہے ترے ذرّات پر

اے چراغِ دودمانِ مصطفےٰ کی خوابگاہ — تیرے خار و خس پہ ہے تابندہ خونِ بیگناہ
تیری جانب اُٹھ رہی ہے اب بھی یزداں کی نگاہ — آ رہی ہے ذرّے ذرّے سے صدائے لاَ اِلٰہ

اے تیری شان، قلعۂ خیبر سے آشکار　　رحلت کی شب رسولؐ کے بستر سے آشکار
خونِ گلوئے مرحب و عنتر سے آشکار　　گردوں پہ جبرئیل کے شہپر سے آشکار

چرچا یہاں بھی تیغ کا تیری، وہاں بھی ہے
رطب اللساں زمیں ہی نہیں آسماں بھی ہے

اے مرتضیٰؑ! امامِ زماں، شیرِ کردگار　　عرفاں کی سلطنت میں نہیں تجھ سا تاجدار
تیری ادائے حرب کا اللہ رے وقار　　اک ضرب پر عبادتِ ثقلین ہو نثار!

تو خندہ زن ہے فتنۂ بدر و حنین پہ
پیغمبری کو ناز ہے تیرے حسینؑ پہ

اے تیری فکر، روحِ دو عالم سے ہم کلام　　اے تیری ذات، قوتِ پیغمبرِ انام
اے فلسفیٔ پاک دل، اے اوّلیں امام　　تیرے قدم کا دوشِ نبوت پہ ہے مقام

اڑتا ہے تجھ کو دیکھ کے رنگ آفتاب کا
روشن ہے تجھ سے طور رسالت مآب کا

خطروں سے ہو سکا نہ کبھی دل میں تو ملول　　کانٹوں کو تیرے عزم نے سمجھا ہمیشہ پھول
ہجرت کی شب، ملا جو تجھے بسترِ رسول　　کیا نفس مطمئن تھا کہ ہنس کر کیا قبول

ایمائے ایزدی کی ادا بھا گئی تجھے
پر ہول خواب گاہ میں نیند آ گئی تجھے

اے جوشؔ! دیکھ سیرتِ مولائے شیخ و شاب — ہر فعل بے نظیر ہے، ہر قول لاجواب
یاں جنبشِ نظر سے ہے گردش میں آفتاب — سُن گوشِ حق نیوش سے اِک قولِ بُوتُراب

یہ قول ہے کلیدِ درِ کائنات کی
یعنی اجل ہے خود ہی محافظ حیات کی

دُنیا کنیز اُس کی ہے سمجھا یہ جس نے راز — کس نیند میں ہے اُمّتِ شاہنشہِ حجاز؟
ٹھنڈی پڑی ہے رُوح میں کیوں آتشِ گداز؟ — کیوں مضمحل ہے دل میں شجاعت کا سوز و ساز؟

جب مرگ، زندگی کی حفاظت کا نام ہے
اے اہلِ دہر! موت سے ڈرنا حرام ہے

سلام

کرچکا سیرِ اصل مرکز پہ اب آنا چاہئے | اِس زمیں پہ اک نئی بستی بسانا چاہئے

پڑ چکے ہیں سینکڑوں رُوحِ شہادت پر حجاب | مومنو! اب اِن حجابوں کو اٹھانا چاہئے

استعاروں میں بیاں کرنے کے دن باقی نہیں | داستاں اب صاف لفظوں میں سُنانا چاہئے

یہ جھجک اچھی نہیں اے سوگوارانِ حسینؑ! | باندھ کر سر سے کفن میداں میں آنا چاہئے

آنچ جب آنے لگے حق پر تو بہرِ زندگی | موت کو بڑھ کر کلیجے سے لگانا چاہئے

تیغ کے دامن کی جب آنے لگے رَن سے ہوا | مرد کو انگڑائی لے کر مسکرانا چاہئے

غور سے سُن غور سے اے نازبردارِ حیات | مرد کو جینے کے دھوکے میں نہ آنا چاہئے

تیری پابوسی کو خم ہے کب سے پشتِ آسماں | اے مسلماں! خاک سے اب سر اُٹھانا چاہئے

یوں اُبھرنے سے رہا نقشِ حیاتِ جاوداں | زندگی پر خون کی نہریں لگانا چاہئے

آفریں اے ہمّتِ مردانۂ ابنِ رسولؐ! | صاحبِ غیرت کو یونہیں موت آنا چاہئے

خیر سطحِ بہر و مہ تک تو گوارا ہے زوال | اِس سے نیچے مردِ مومن کو نہ جانا چاہئے

بسترِ احمدؐ شبِ ہجرت یہ دیتا ہے صدا | اے علیؓ! مردوں کو یونہی نیند آنا چاہئے

کچھ سُنا کیا کہہ رہا ہے جوشؔ! اکبر کا شباب؟
سینہ میں تیر دل کے جوانی کو کھانا چاہئے

شمعِ ہدایت

اے کہ ترے جلال سے ہِل گئی بزمِ کافری
رعشہ خوف بن گیا رقصِ بُتانِ آذری

خشک عرب کی ریگ سے لہر اُٹھی نیاز کی
قُلزمِ نازِ حُسن میں اُف رے تری شناوری

اے کہ ترا غبارِ راہ تابشِ رُوئے ماہتاب
اے کہ ترا نشانِ پا نازشِ مہرِ خاوری

اے کہ ترے بیان میں نغمۂ صلح و آشتی
اے کہ ترے سکوت میں خندۂ بندہ پروری

اے کہ ترے دماغ پر جنبشِ پرتوِ صفا
اے کہ ترے خمیر میں کاوشِ نورگستری

چھین لیں تُو نے مجلسِ شرک و خودی سے گرمیاں
ڈال دی تُو نے پیکرِ لات و ہبل میں تھرتھری

تیرے قدم پہ جبہ سا رومِ و عجم کی نخوتیں
تیرے حضور سجدہ ریز جبینِ عرب کی خودسری

تیرے کرم نے ڈال دی طرحِ خلوص و بندگی
تیرے غضب نے بند کی رسم و رہِ ستمگری

تیرے سخن سے دب گئے لاف و گزافِ کفر کے
تیرے نفس سے بجھ گئی آتشِ سحرِ سامری

لحن سے تیرے منتظم پست و بلند کائنات
ساز سے تیرے منضبط گردشِ چرخِ چنبری

چینِ ستم سے بے خبر تیری جبینِ دل کشی
حرفِ وفا سے تابناک تیری بیاضِ دلبری

تیری پیمبری کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے
بخشا گدائے راہ کو تُو نے شکوہِ قیصری

بھٹکے ہوؤں پہ کی نظر رشکِ خضر بنا دیا
راہزنوں کو دی ندا بن گئے شمعِ رہبری

سُلجھا ہوا تھا کس قدر تیرا دماغِ حق رسی
پگھلا ہوا تھا کس قدر تیرا دلِ پیمبری

چشمہ تیرے بیان کا غارِ حرا کی خامشی — نغمہ ترے سکوت کا نعرۂ فتحِ خیبری

زمزمہ تیرے ساز کا لحنِ بلالؓ حق نوا — صاعقہ تیرے ابر کا لرزشِ روحِ بوذریؓ

آئینہ تیرے خُلق کا طبعِ حسنؓ کی سادگی — جذبہ ترے عروج کا آلِ عبا کی برتری

جھلکیاں تیرے ناز کی جنبشِ کاکلِ حسینؓ — رنگ ترے نیاز کا گردشِ چشمِ جعفریؓ

شان ترے ثبات کی عزمِ شہیدِ کربلا — شرح ترے جلال کی ضربتِ دستِ حیدریؓ

رنگ ترے شباب کا جلوۂ اکبرِ قتیل — نقش ترے شکیب کا خونِ گلوئے اصغریؓ

تیرا لباسِ فاخرہ چادرِ کہنۂ بتولؓ — تیری غذائے خوش مزا نانِ شعیرِ حیدری

تجھ پہ نثار جان و دل اُٹھ کے ذرا یہ دیکھ لے
دیکھ رہی ہے کس طرح ہم کو نگاہِ کافری

تیرے گدائے بے نوا تیرے حضور آئے ہیں — چہروں پہ رنگِ خستگی سینوں میں دردِ بے پری

آج ہوائے دہر سے اُن کے سروں پہ خاک ہے — رکھی تھی جن کے فرق پر تُو نے کلاہِ سروری

تیرے فقیر اور دیں کوچہ گفتہ میں صدا — تیرے غلام اور کریں اہلِ جفا کی چاکری

طرۂ کلہ میں جن کے تھے لعل و گہر ٹکے ہوئے — حیف اب اُن سروں میں ہے دردِ شکستہ خاطری

جتنی بلندیاں تھیں سب ہم سے فلک نے چھین لیں — اب نہ وہ تیغِ غزنوی اب وہ نہ تاجِ اکبری

اُٹھ کہ ترے دیار میں پرچمِ کفر کھل گیا — دیر نہ کر کہ پڑ گئی صحنِ حرم میں ابتری

خیز و دلِ شکستہ را، دولتِ سوز و ساز دہ
مُسلمِ خستہ حال را، رخصتِ تُرکتاز دہ

آفتاب سے خطاب

آفتاب، اے نو عروسِ صبح کے آئینہ دار   اے کہ قبضے میں ترے سر رشتۂ لیل و نہار
اے کہ تیری ہر نظر، اطرافِ عالم سے دوچار   اے کہ تیرے ساز پر ہستی کے نغموں کا مدار

ذرّے ذرّے کو تجلّی کا پتا دیتا ہے تو
پتھّروں کو چوم کر ہیرا بنا دیتا ہے تو

دور سے آتا ہے تو ہم کو جگانے کے لئے   نامِ غفلت کا زمانے سے مٹانے کے لئے
گدگداتا ہے شگوفوں کو ہنسانے کے لئے   خاک سے شبنم کے قطروں کو اٹھانے کے لئے

دیکھ کر پھولوں کی ناداری تڑپ جاتا ہے تو
رنگ بن کر عارضِ گلشن میں کھپ جاتا ہے تو

اے کہ تو ہے جملہ موجوداتِ عالم کی مراد   بات میں تیری شعاعوں کے ہے نبضِ ابر و باد
دشمنانِ زندگی سے تو ہے مصروفِ جہاد   تیری کرنیں ہیں عناصر میں نظامِ اتحاد

حسنِ لیلائے جہاں پر نور تری محفل میں ہے
تیرے دم سے ولولہ نشو و نما کے دل میں ہے

وجد کرتی ہے زمیں تیری ادائے ناز پر — بحر سر دھنتے ہیں تیرے شعلۂ آواز پر
ثابت و سیّار مفتوں ہیں ترے انداز پر — رقص کرتا ہے نظامِ دہر تیرے ساز پر
سوزِ بیداریٔ عالم کا تری نالوں میں ہے
زمزمہ روئیدگی کا تیرے افسانوں میں ہے

ہاں دیئے جا تال یُونہی مطربِ بزمِ حیات! — وجد میں دن ہے ترے نغموں سے اور غش میں ہے رات
مایۂ صد فخر ہے فانی جہاں کو تیری ذات — سرخرو رہ تا قیامت اے غرورِ کائنات
گرم تیرے جام سے ہستی کا میخانہ رہے
رہتی دُنیا تک ترا گردش میں پیمانہ رہے

چھیڑ کچھ باتیں ہمارے نامور اجداد کی — تُو تو ہے چھانے ہوئے گلیاں جہانِ آباد کی
کچھ تو کیفیّت بیاں کر ملّتِ برباد کی — تیری نظروں میں تو ہونگی رونقیں بغداد کی
کتنے سکّے تُو نے دیکھے ہیں ہمارے نام کے؟
اُے مؤرّخ سطوتِ پارینۂ اسلام کے

اپنے نقشِ پا میں تھی، شانِ کلاہِ قیصری — خانہ زادوں میں تھی اپنے صولتِ اسکندری
اپنی آنکھوں سے برستا تھا جلالِ حیدری — ٹھوکروں کی زد پہ رہتا تھا مذاقِ آذری
دنگ تھا ہر زمزمہ بانگِ اذاں کے سامنے
کوہ جھک جاتے تھے اپنے کارواں کے سامنے

یاد تو ہونگے تجھے وہ دن بھی اے گردوں حشم؟ — اہلِ حق جن دنوں میں تھے صاحبِ تاج و علَم

سادگی پر کس قدر مفتوں تھے خُدامِ حرم — بستہ نانِ جویں تھا خوانِ اربابِ کرم

چترِ شاہی تھے سروں پر دلق زیبِ دوش تھے

آہ جب "فقر و امارت" دونوں ہم آغوش تھے

آفتاب اے نیلگوں دریا کے رخشندہ گہر — اے کہ اُڑ جاتا ہے تجھ سے خوابِ غفلت کا اثر

سچ بتا پھر بھی کبھی آئے گی کیا ایسی سحر — جگمگاتا ہوگا تاجِ زر جب اپنے فرق پر

آنکھ کھُل جائے گی غفلت سے جہاں آباد کی؟

جاگ اُٹھے گی سلطنت غرناطہ و بغداد کی؟

مُسلمِ خوابیدہ اب بیدار بھی ہوگا کبھی؟ — کھا رہا ہے ٹھوکریں خوددار بھی ہوگا کبھی؟

بُزدلی کے نام سے بیزار بھی ہوگا کبھی؟ — جان دینے کے لیۓ طیّار بھی ہوگا کبھی؟

طُور سے کیا پھر صدائے لن ترانی آئے گی؟

سچ بتا کیا پھر زلیخا پر جوانی آئے گی؟

مرحبا اے آفتابِ رُوح پرور! مرحبا — کیا دیا تُو نے جوابِ مبتدیں ڈوبا ہُوا

تُو نے پھر سے مُردہ ارمانوں کو زندہ کر دیا — تیرے قرباں پھر تو دُہرا دے یہ تُو نے کیا کہا؟

"چھٹ رہی ہیں ظلمتیں شب کی سحر ہونے کو ہے

آفتابِ تاجِ مسلم جلوہ گر ہونے کو ہے"

مژدہ اے مسلم! کہ تو ہر رنگ میں پائندہ ہے — زندگی کے گو نہیں آثار، پھر بھی زندہ ہے

اک تبسم سا لبِ تقدیر پر رخشندہ ہے — ایک چنگاری ضمیرِ حق میں پھر تابندہ ہے

زندگانی کی سحر تربت ہوا آنے کو ہے

چرخ سے پھر "قُم بِاِذنِی" کی صدا آنے کو ہے

تجھ کو کیا پروا، ہوائے دہر اگر ناساز ہے — تجھ کو اوجِ لامکاں تک رخصتِ پرواز ہے

اُٹھ کہ سینے میں ترے ارض و سما کا راز ہے — بربطِ جبریل کی تو آخری آواز ہے

ہو چکا ہے ختم تجھ پر سلسلہ الہام کا

فقرۂ آخر ہے تو اللہ کے پیغام کا

سبزۂ خوابیدہ وہ انگڑائیاں لے کر اُٹھا — صبح ہونے کو ہے تہ کر غفلتیں، بستر اُٹھا

بحر ہے بے چین، کشتی ڈال دے لنگر اُٹھا — تاجِ شاہی منتظر ہے اے مسلماں سر اُٹھا

دیکھ رحمت کی گھٹائیں ماہیِ بے آب ہیں

تیری کھیتی پر برسنے کے لیے بیتاب ہیں

فتحِ سمرنا

اے قوم! مبارک ہو کہ ساحل نظر آیا　　غربت میں چراغِ سرِ منزل نظر آیا

گردوں پہ جمالِ مہِ کامل نظر آیا　　محفل میں کوئی رونقِ محفل نظر آیا

یہ دن بھی بڑے فخر و مباہات کا دن ہے

معشوق سے عاشق کی ملاقات کا دن ہے

اعجاز ہے اسلام کی جادو نظری کا　　زائل ہے اثر روح سے بے بال و پری کا

صد شکر کہ وہ دور گیا بے خبری کا　　بیدار ہے پھر عزم جوانانِ جری کا

شب ختم ہوئی انجمن آرا نکل آیا

وہ صبح کا گردوں پہ ستارا نکل آیا

دشوار تھا اُلجھی ہوئی زلفوں کا سنورنا　　کچھ کھیل نہ تھا راہِ صعوبت سے گزرنا

اعجاز ہے ڈوبی ہوئی زلفوں کا اُبھرنا　　اسلام! مبارک ہو تجھے فتحِ سمرنا

جب تک کہ طلسمِ سحر و شام رہے گا

واللہ زمانے میں ترا نام رہے گا

احمد ایسے نے کیا فوجِ سیاہ کار کو روکا   شیرانہ بڑھے لشکرِ کفّار کو روکا
اسلام کی گرتی ہوئی دیوار کو روکا   کس شان سے تلوار پہ تلوار کو روکا

ہنگامِ دعا ہو تو دمِ سرد ہوں ایسے
جب جنگ ہو ایسی تو جواں مرد ہوں ایسے

ہاں یوں نہیں ترقی پہ رہے ہمتِ عالی   ہر خطّۂ اسلام ہو اغیار سے خالی
تکمیل کرے قوّتِ بازو ئے کمالی   دشمن پہ چمکتی رہے شمشیرِ ہلالی

کھل جائے کہ اس زمیں کوئی میل نہیں ہے
اسلام ہے اسلام ہنسی کھیل نہیں ہے

رحلتِ محمدؐ علی[1]

اَے متاعِ بُردۂ ہندوستان و ایشیا!
اے کہ تھا ناخن پہ تیرے عقدۂ حق کا مدار

غش تھا کاوش پر تری اندازۂ صبح و مسا
خم تھی قدموں پہ ترے نیرنگیٔ لیل و نہار

اے غرورِ ملک و ملت! تو وہاں لیتا تھا سانس
مَوت جس منزل پہ بنتی ہے حیاتِ پائیدار

وقت کے سیلاب سے تیرا سفینہ ہے بلند
سیرتِ پیغمبرِ اسلام کے آئینہ دار!

تجھ کو بخشی تھی مشیّت نے اِک ایسی زندگی
جس بہا در زندگی کو مَوت پر آتا ہے پیار

تیرے آگے لرزہ براندام تھی رُوحِ فرنگ
اے دلِ ہندوستاں کے عزمِ تُند و استوار

طنطنے سے تیری ہیبت آفریں آواز کے
تھی حسینؓ ابنِ علیؓ کی استقامت آشکار

ڈوب جاتی تھی دلِ باطل میں لہراتی ہوئی
تیرے لہجے میں چمکتی تھی وہ تیغِ آبدار

موڑ کر رکھ دی تھی تُو نے جنگ کے میدان میں
اہلِ بدعت کی کلائی، خنجرِ باطل کی دھار

تجھ سے آتا تھا پسینہ افسرِ اَورنگ کو
اے کہ ہمّت تھی تری قوّت شکنِ سُلطاں شکار

خون میں تیرے نہاں تھی جنبشِ تیغِ علیؓ
خاک میں تیری ودیعت تھا مزاجِ ذوالفقار

تیری سیرت میں تھی مضمر صَولتِ پیغمبری
تیری فطرت میں تھی پنہاں سطوتِ پروردگار

قوم کو بخشا ہے تیری موت نے وہ بانکپن
کج ہوئی جاتی ہے ماتھے پر کُلاہِ افتخار!

[1] مولانا محمد علی مرحوم۔

شاہنشاہ ہمایوں کا مقبرہ[1]

اے شہنشاہِ ہمایوں کی مقدس خوابگاہ! دیکھتی ہے تجھ میں اک دنیائے غم میری نگاہ
آنسوؤں سے تیرے سقف و بام دھونے کیلئے تجھ میں آیا تھا کوئی پوشیدہ ہونے کیلئے
جھلملاتی تھی تری محراب میں قندیلِ شاہ موت کے دامن میں لی تھی زندگانی نے پناہ

اُس طرف اغیار کی فوجیں قطار اندر قطار
اِس طرف گنبد میں اک بیمار بوڑھا تاجدار

بار ادھر فرقِ جہانبانی پہ تاجِ سروری چست اُدھر ٹھوکر لگانے کیلئے "سوداگری"

آسماں تھا زلزلے میں اور تلاطم میں زمیں
اس کے آگے کیا ہوا؟ مجھ سے کہا جاتا نہیں

اس ترے گنبد کے نیچے اے جہانِ اضطراب ایسی دو قبریں ہیں دنیا میں نہیں جن کا جواب
اک مزارِ کج کلہ، اک کج کلاہی کا مزار شاہ کی تربت کے پہلو میں ہے شاہی کا مزار

اُف بھرے آتے ہیں آنسو دیدۂ غمناک میں
دفن ہے تاتاریوں کا تاج تیری خاک میں

---

[1] دہلی کے آخری تاجدار کی گرفتاری یہیں عمل میں آئی تھی۔

متولّیانِ وقفِ حسین آباد سے خطاب

لکھنؤ میں وقفِ حسین آباد ایک شاہی وقف ہے، جس کے غیور متولّی حسین آباد اور آصف الدولہ بہادر کے مقبروں میں محرّم کی آٹھویں اور نویں کو بہت بڑے پیمانے پر چراغاں کا اہتمام کرتے ہیں۔ محرّم! اور چراغاں!!!

آٹھویں کے چراغاں کی یہ ایک شرمناک و غلامانہ خصوصیت ہے کہ اس شب کا کھیل تماشا "صرف" صاحب لوگوں کے لئے مخصوص ہوتا ہے جو اپنے محبوبوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ادھر سے اُدھر قہقہے مارتے پھرتے ہیں۔

اس دن کسی ہندوستانی کو امام باڑوں میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے، صرف بعض ممتاز ہندوستانیوں کو پاسوں سے سرفراز کیا جاتا ہے البتہ صرف ہندوستانی اس شرط سے داخل ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے ہندوستانی لباس کو ترک کر کے انگریزی لباس میں آئیں۔

سُن سکو تو چند نالے ہیں دلِ غمناک کے — اے گرامی ممبرو! وقفِ حسین آباد کے

مشعلوں کی جگمگاہٹ کی ہوا کرتی ہے "شو"[1] — ہر محرّم کی نویں اور آٹھویں تاریخ کو

وہ اُداس اور تشنہ و راتیں سرِ جوئے فرات — جن کے سنّاٹے کے اندر گم تھی رُوحِ کائنات

جن کی رَو میں درہم و برہم تھا دُنیا کا نظام — جن کی خاموشی میں غلطاں تھا شہادت کا پیام

جن کی ہلچل سے تلاطم تھا دلِ آفاق میں — جھلملائی تھی وفا کی شمع جن کے طاق میں

جن کی ظلمت کو منوّر کر رہے تھے دل کے داغ — گُل ہُوا تھا جن کی آندھی میں مدینے کا چراغ

پُرفشاں تھے جن کے سنّاٹے جرس کے واسطے
تُم نے اِن راتوں کو چھانٹا ہے ہوس کے واسطے

[1] نمائش۔

مقتلوں میں جس جگہ خونِ شہیداں کا ہو رنگ ۔۔۔ سیر کرنے کو بُلائے جائیں واں اہلِ فرنگ

کیا حمیّت ہے کہ اپنوں کیلئے ہو روک تھام ۔۔۔ رُوپ میں بھی غیر کے آئے کوئی تو اذنِ عام

یہ تسلّی، یہ خوشامد، یہ زبُوں اندیشیاں ۔۔۔ غم کدہ مُسلم کا ہو نصرانیوں کا بوستاں

دیدۂ ناہید ہو جس بزم میں افسانہ گر ۔۔۔ اُس جگہ دی جائے دعوت چشمکِ مرّیخ کو

داغہائے دل میں کھولا جائے میخانے کا باب ۔۔۔ قہقہے ہوں آنسوؤں کی انجمن میں باریاب

بزمِ عصمت میں سرِ آنکھوں پر لیا جائے گناہ ۔۔۔ مقبرے کو اور بنائے آسماں تفریح گاہ

دعوتِ حرف و حکایت، زلزلے کی رات میں ۔۔۔ مُنعقِد ہو جشن اشکوں کی بھری برسات میں

بامِ شیون پر کھُلے مدحِ تبسّم کا عَلَم ۔۔۔ خُوں کے قطروں پہ اور اربابِ عشرت کے قدم

کشتیِ صہبا چلے اہلِ وفا کے خون میں ۔۔۔ آخری ہچکی بھری جائے گراموفون میں

لشکرِ شادی سے رَوندی جائے غمخانے کی خاک ۔۔۔ غازۂ خوباں بنائی جائے پروانے کی خاک

چنگ و بربط کا تسلّط ہو دیارِ آہ میں ۔۔۔ اہلِ ماتم لاش کو رکھیں نمائش گاہ میں

دیدۂ عشرت اُٹھے صد پارہ لاشا دیکھنے ۔۔۔ ہنسنے والے آئیں رونے کا تماشا دیکھنے

جُوئے خوں! اور اُس پہ تیراکی کا میلا، الحذر ۔۔۔ غیرتِ اسلام! تجھ کو کھا گئی کس کی نظر؟

رُوحِ مومن کو عطا، بارِ خدا! ادراک ہو

یہ نہیں تو صُور پھُنک جائے کہ قصہ پاک ہو!

آنسو اور تلوار

کربلا کا گرم میداں، تمتماتا آفتاب — کشمکش، ہلچل، تلاطم، شور، غوغا، اضطراب
صورِ اسرافیل سے ملتا ہوا غوغائے جنگ — برچھیاں، نیزے، کٹاریں، تیر، تلواریں، تفنگ
غازیوں کا طنطنہ، بانگِ رجز کا دبدبہ — طبل کی دُوں دُوں، کمانوں کے کڑکنے کی صدا
آگ کی لپٹیں، شعاعوں کی تپش، گرمی کا زور — اسلحہ کی کھڑکھڑاہٹ، لُو کی رَو، قرنا کا شور
جنگ جو میداں میں تیغ دودم تولے ہوئے — اہلِ ہمّت دھوپ میں کالے علَم کھولے ہوئے
محفلِ باطل میں حق کی داستاں کہتا ہوا — سُرخ ذرّوں پر جوانوں کا لہو بہتا ہوا
قلبِ اعدا پر حسینؑ ابنِ علیؑ کا رعب و داب — قطرۂ بے مایۂ شبنم پہ گویا آفتاب
رسم و راہِ حق سے ربط، آئینِ باطل سے عناد — عہدِ جانبازی، سرِ مردانگی، عزمِ جہاد

شوقِ آزادی، خیالِ سرفروشی، ذوقِ مرگ
یہ تھے انصارِ حسینؑ ابنِ علی کے ساز و برگ

تم بھی ہو منجملۂ انصارِ شاہِ کربلا — سچ کہو، ان میں سے تم کو کیا وراثت میں ملا؟
چند اشکوں کے لطائف، چند شیون کے نکات؟ — کیوں یہی لے دے کے ہے یارو تمہاری کائنات؟
اے عزیزو! اس بلا کی بےحسی کا کیا علاج؟ — چند آہیں، اور وہ بھی بستۂ رسم و رواج

ہاں ازل سے ہے یہ تقسیمِ وراثت کا اصول
مرد کو دیتے ہیں شعلوں کی لپک، عورت کو پھول

مرد کو ملتی ہے ترکے میں چھلکتی ذوالفقار — عورتوں کو شاخِ گل کا لوچ، شبنم کا نکھار
مرد کو ہوتا ہے حاصل فاتحانہ قہقہہ — عورتوں کو ہچکیوں کی گونج، شیون کی صدا

اے کہ تم پوشاکِ حربی کے عوض پہنے ہو گون[1]؟
دل میں خود سوچو، تم اس تقسیم سے ہٹتے ہو کون؟

خیر اب تک جو کبھی ہوتا تھا عزیزو ہو چکا — لیکن اب حق اہلِ جرأت کو یہ دیتا ہے صدا
جذبۂ مردانگی سے بڑھ کر بنتا ہے کون؟ — حاملِ عزمِ شہیدِ کربلا بنتا ہے کون؟
ناؤ اپنے خون کے دریا میں کھینے کے لئے — کون بڑھتا ہے علیؑ کی تیغ لینے کے لئے
آج وہ سادات آئے سامنے جس کا شباب — دے سکے شیبِ حبیب ابنِ مظاہر کا جواب
کون ہے تم میں سے عبدِ خاصِ ربِّ مشرقین — کس کی نبضوں کو عطا ہو آتشِ خونِ حسینؑ؟
کون خون اپنا بہا سکتا ہے پانی کی طرح؟ — کون مٹ سکتا ہے اکبرؑ کی جوانی کی طرح؟
کون سینے میں جلاتا ہے چراغ احساس کا! — کون کاندھے پر اٹھاتا ہے علم عباسؑ کا؟
آئے، تقلیدِ حسینؑ ابنِ علیؑ کرتا ہے کون — کامل آزادی سے جینے کیلئے مرتا ہے کون؟
کون میداں میں سنبھالے گا بصد شانِ وقار — سورما عباسؑ کا پرچم، علیؑ کی ذوالفقار

---

[1] زنانہ لبادہ

مومنو! حق کی تمہیں سوگند ایماں کی قسم
یہ صدا سُن کر بڑھو کہتے ہوئے "حاضر ہیں ہم"
حکم دو تاریخ کو، دُہرائے اپنی داستاں یہ نہیں ہمت تو ہاتوں میں پہن لو چوڑیاں
مردوہ کب ہے جو شر سے جو اُبھر سکتا نہیں
حق ہی جینے کا نہیں اُس کو جو مر سکتا نہیں

گریباں کو کیا ہوا

اے دل! جنونِ عشق کے ساماں کو کیا ہوا؟ / ہوتا نہیں ہے چاکِ گریباں کو کیا ہوا؟

فکرِ سخن کا نور کہاں جا کے چھپ گیا؟ / تخئیل کے تبسمِ پنہاں کو کیا ہوا؟

رسمِ وفا کی کاہشِ پیہم کدھر گئی؟ / ذوقِ نظر کی کاوشِ پنہاں کو کیا ہوا؟

گلشن ہیں زرد، پھول کہاں جا کے بس گئے؟ / کانیں ہیں سرد، لعلِ بدخشاں کو کیا ہوا؟

ہے خاکِ نجد برہنہ ہیں گویا جھلی ہوئی / اے قیسِ عامری! دلِ سوزاں کو کیا ہوا؟

چھائی ہوئی ہے چہرۂ ہستی پہ مُردنی / الطافِ خضر و چشمۂ حیواں کو کیا ہوا؟

وہ جوہری رہے، نہ وہ گوہرِ نظر فریب / بازارِ مصر و یوسفِ کنعاں کو کیا ہوا؟

شاخوں میں وہ لچک ہے، نہ غنچوں میں تازگی / طبعِ نسیم و فطرتِ بستاں کو کیا ہوا؟

اگلی سی وہ چمک نہیں اب آشیاں کے گرد / کُنجِ قفس میں مُرغِ پر افشاں کو کیا ہوا؟

کب سے ہیں بے نواؤں کے دستِ طلب دراز / اے رُوحِ فیض! ہمّتِ سلطاں کو کیا ہوا؟

ہر اک صدف ہے آنکھ میں آنسو بھرے ہوئے / یا رب! نزولِ قطرۂ نیساں کو کیا ہوا؟

آنکھیں ہیں بند، دید کی حسرت پہ کیا بنی؟ / دل ہے خجل، تصوّرِ جاناں کو کیا ہوا؟

رُوحِ صبا میں اب نہیں انفاسِ عیسوی / گوہر فشانیٔ لبِ خوباں کو کیا ہوا؟

سُونی ہیں ایک عصر سے راتیں شباب کی | بزمِ آفرینیِ مہرِ تاباں کو کیا ہوا؟

ناخن سے اپنے چھیڑ رہا ہے کوئی نگار
اس پر بھی سُن پڑی ہے، رگِ جاں کو کیا ہوا؟

کعبے میں بار پا گئے اصنامِ آذری | کاشانۂ خلیل کے دَرباں کو کیا ہوا؟

اب آستانِ کفر پہ ہیں سجدہ ریزیاں | اے کردگار، مردِ مسلماں کو کیا ہوا؟

سینے میں اس گروہ کے کیوں اُڑ رہی ہے خاک | گنجِ حدیث و دولتِ قرآں کو کیا ہوا؟

قبضوں پہ ہاتھ ہیں، نہ جبینیں ہیں خاک پر | ذوقِ جہاد و جذبۂ عرفاں کو کیا ہوا؟

شانِ دعائے حمزہؓ و حیدرؓ کدھر گئی | رُوحِ دعائے بُوذرؓ و سلماںؓ کو کیا ہوا؟

عزمِ حسینؓ ہے، نہ ثباتِ ابُوترابؓ | صبرِ بلال و ضبطِ فراواں کو کیا ہوا؟

ڈنکے بجا رہے ہیں شجاعت کے گوسفند | کوئی بتاؤ شیرِ نیستاں کو کیا ہوا؟

تن کر مقامِ صدر پہ بیٹھے ہیں پُشت رُو | اے بزمِ ناز، خسروِ خوباں کو کیا ہوا؟

پھر ابرِ سامری سے برستے ہیں اژدہے | یارو، عصائے موسیٰؑ عمراں کو کیا ہوا؟

آنکھیں دکھا رہے ہیں ستارے خدا کی شان | اے آسمان! مہرِ درخشاں کو کیا ہوا؟

اے جوشؔ! دیکھ مُنھ تو گریباں میں ڈال کر
کیا پُوچھتا ہے، مردِ مسلماں کو کیا ہوا؟

سوگوارانِ حسینؑ سے خطاب

انقلابِ تُند خُو جس وقت اُٹھائے گا نظر (۱) کروٹیں لے گی زمیں ہوگا فلک زیر و زبر

کانپ کر ہونٹوں پہ آجائے گی رُوحِ بحر و بر　　وقت کا پیرانہ سالی سے بھڑک اُٹھے گا سر

موت کے سیلاب میں ہر خشک و تر بہ جائے گا

ہاں مگر نامِ حسینؑ ابنِ علیؑ رہ جائے گا

کون؟ جو ہستی کے دھوکے میں نہ آیا وہ حسینؑ　　سر کٹا کر بھی نہ جس نے سر جھکایا وہ حسینؑ

جس نے مر کر غیرتِ حق کو جِلایا وہ حسینؑ　　موت کا مُنہ دیکھ کر جو مُسکرایا وہ حسینؑ

کانپتی ہے جس کی پیری کو جوانی دیکھ کر

ہنس دیا جو تیغِ قاتل کی روانی دیکھ کر

ہاں نگاہِ غور سے دیکھ اے گروہِ مومنیں (۲) جا رہا ہے کربلا خیر البشر کا جانشیں

آسماں ہے لرزہ براندام جنبش میں زمیں　　فرق پر ہے سایہ افگن شہپرِ روح الامیں

اے شگوفو! السّلام اے خفتہ کلیو الوداع

اے مدینے کی نظر افروز گلیو الوداع

ہوشیار اے ساکت و خاموش کوفے ہوشیار (۳) آ رہے ہیں دیکھ وہ اعدا قطار اندر قطار

ہونے والی ہے کشاکش درمیانِ نور و نار　　اپنے وعدوں پر پہاڑوں کی طرح رہ استوار

صبح قبضہ کر کے رہتی ہے اندھیری رات پر
جو بہادر ہیں اڑے رہتے ہیں اپنی بات پر

لو کے جھکڑ چل رہے ہیں، غیظ میں ہے آفتاب (۴) سرخ ذرّوں کا سمندر کھا رہا ہے پیچ و تاب
تشنگی، گرمی، تلاطم، آگ، وحشت، اضطراب   کیوں مسلمانو! یہ منزل اور آلِ بوتراب
کس خطا پر تم نے بدلے ان سے گن گن کے لیے
فاطمہؑ نے ان کو پالا تھا اسی دن کے لیے

اور وہ مقتل کا سماں ہے، اور وہ حریفوں کی قطار (۵) یہ رہی ہے نہر، لو وہ سامنے بیگانہ وار
وہ ہوا اسلام کا سرتاج مرکب پر سوار   دھوپ میں وہ برق سی چمکی، وہ نکلی ذوالفقار
آ گئی رن میں اجل تیغ دو دم تولے ہوئے
جانب اعدا بڑھا دوزخ وہ منہ کھولے ہوئے

دور تک ہلنے لگی گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمیں   کوہ تھرانے لگے، تیورا گئی فوجِ لعیں
زد پہ آ کر کوئی بچ جائے یہ ممکن نہیں   لو حسینؑ ابن علیؑ نے وہ چڑھا لی آستیں
آستیں چڑھتے ہی خونِ ہاشمی گرما گیا
ناخدا ہشیار، دریا میں تلاطم آ گیا

ظہر کے ہنگام کچھ جھکنے لگا جب آفتاب (۶) ذوقِ طاعت نے دلِ مولا میں کھایا پیچ و تاب
آ کے خیمے سے کسی نے دوڑ کر تھامی رکاب   ہو گئی بزمِ رسالت میں امامت باریاب

تشنہ لب ذرّوں پہ خونِ مشکبو بہنے لگا

خاک پر اسلام کے دل کا لہو بہنے لگا

آفریں چشم و چراغِ دُودمانِ مصطفےٰ (۷) آفریں صد آفریں و مرحبا صد مرحبا

مرتبہ انسان کا تُو نے دوبالا کر دیا   جان دے کر اہلِ دل کو تو سبق یہ دے گیا

کشتیٔ ایماں کو خونِ دل میں کھینا چاہیئے

حق پہ جب آنچ آئے تو یوں جان دینا چاہیئے

اے محیطِ کربلا اے ارضِ بے آب و گیاہ (۸) جراتِ مردانۂ شبیرؑ کی رہنا گواہ!

حشر تک گونجیں گے تجھ میں نعرہ ہائے لا الٰہ   سج رہے گی تجھ سے فرقِ رسالت پر کلاہ

یہ شہادت اک سبق ہے حق پرستی کے لئے

اک ستونِ روشنی ہے بحرِ ہستی کے لئے

تم سے کچھ کہنا ہے اب اے سوگوارانِ حسینؑ (۹) یاد بھی ہے تم کو تعلیمِ امامِ مشرقین؟

تا کجا بھولے رہو گے غزوۂ بدر و حنین؟   کب تلک آخر ذاکروں کے تاجرانہ شور و شین؟

ذاکروں نے موت کے سانچے میں دل ڈھالے نہیں

یہ شہیدِ کربلا کے چاہنے والے نہیں

کہہ چکا ہوں بار بار اور اب بھی کہتا ہوں یہی   ماتمِ شبیر میں ہے اک پیامِ زندگی

لیکن اتنی عرض ہے اب لے تو اے سیّد زیدی   اپنی پنجابی میں یوں کہہ گئے خونِ سر عرش علی

ابنِ کوثر! پہلے اپنی تلخ کامی کو تو دیکھ
اپنے ماتھے کی ذرا مُہرِ غلامی کو تو دیکھ

جس کو ذلّت کا نہ ہو احساس وہ نامرد ہے
تنگ پہلو ہے وہ دِل جو بے نیازِ درد ہے

حق نہیں جینے کا اُس کو جس کا چہرہ زرد ہے
خودکشی ہے فرض اُس پر خون جس کا سرد ہے

وقتِ بیداری نہ غالب ہو سکے جو نوم پر
لعنت ایسی خُفتہ ملّت پر لعنت ایسی قوم پر

زندہ رہنا ہے تو میرِ کارواں بنکر رہو
اس زمیں کی پستیوں میں آسماں بنکر رہو

دورِ حق ہو تو نسیمِ بوستاں بنکر رہو
عہدِ باطل ہو تو تیغِ بے اماں بنکر رہو

دوستوں کے پاس آؤ نور پھیلاتے ہوئے
دشمنوں کی صف سے گزرو آگ برساتے ہوئے

دورِ محکومی میں راحت کفر، عشرت ہے حرام
مہوشوں کی چاہ، ساقی کی محبت ہے حرام

عِلم ناجائز ہے، دستارِ فضیلت ہے حرام
انتہا یہ ہے غلاموں کی عبادت ہے حرام

گوشۂ ذلّت میں ٹھہرنا کیا، گزرنا بھی حرام
صرف جینا ہی نہیں، اس طرح مرنا بھی حرام!

کافرِ نعمت مسلمان

(یہ نظم حیدر آباد کی ایک محفلِ میلاد کیواسطے قلم برداشتہ لکھی گئی تھی۔)

تم نہ بگڑو، تو میں پوچھوں ڈرتے ڈرتے ایک بات
سچ بتاؤ کون ہے اس وقت ننگِ کائنات

ہٹ گیا ہے کون ابرِ زندگی کی چھاؤں سے
کس نے اپنا تاج رَوندا ہے خود اپنے پاؤں سے؟

اس زمین و آسماں کی شہریاری چھوڑ کر
کون بھاگا ہے غلامی کی طرف مُنہ موڑ کر؟

ہاں کہنا کون ہے، ان فعل کے عیبوں میں طاق؟
کذب، غیبت، افترا، اسراف، بد بینی، نفاق؟

آج کتراتا ہوا وحدانیت کی راہ سے
یہ مُرادیں مانگتا ہے کون غیر اللہ سے؟

جھومتا ہے کون قوالوں کے ہر اک بول پر؟
کون یہ عرسوں میں پہروں ناچتا ہے ڈھول پر؟

بن کے "ذاکر" سیم و زر کے ڈھیر پر گرتا ہے کون؟
خونِ اولادِ پیمبر بیچتا پھرتا ہے کون؟

پشتِ مرکب چھوڑ کر تکیوں پہ ہے کس کا مدار؟
جنگ کے میداں میں کس نے پھینک دی ہے ذوالفقار

حملۂ عشرت میں کی ہے یوں خدا کی کس نے یاد؟
فربہی کی کشمکش سے کر نہیں سکتا جہاد

کون حلوں کی مشقت سے ہے یوں زار و حزیں؟
ضُعف کی شدت سے جو تلوار اٹھا سکتا نہیں

گر گیا ہے آسماں سے کس کا پرچم خاک پر؟
جم گئی ہے برف کس کے شعلۂ چالاک پر؟

بن چکا ہے کس کا خودِ آہنی رشکِ حباب؟
مل چکا ہے کس کے انگاروں کو "شبنم" کا خطاب؟

کون ہیں یہ لوگ؟ کچھ سمجھے بھی اے اطفالِ دیں؟
مجھ کو یہ وہم ہوتا ہے کہیں تم تو نہیں؟

تم نہیں تو پھر یہ جینے کے عوض مرتا ہے کون؟
روز و شب آیاتِ حق سے دل لگی کرتا ہے کون؟

جب یہ عالم ہے تو وابستہ رہو احمد نام سے
تم کو پھر کیا واسطہ پیغمبرِ اسلام سے

حق کے دشمن نفس کے پابند باطل کے غلام
تم کو کیا حق ہے کہ تم کہلاتے ہو شادکام

پختگی سے کام کیا افسردگانِ خام کو
تم نے ٹھکرایا ہے حق کے آخری پیغام کو

کب تلوّن کو پتہ چلتا ہے استقلال کا
زاغ کو حق ہی نہیں بلبل کے استقبال کا

دل میں وہ تکبیر کے لیے یا اللہ سوچو تو ذرا
حق نے تم سے کیا کیا؟ اور تم نے حق سے کیا کیا!

حق نے چھیڑا تھا زمیں پر نغمۂ امّ الکتاب
تم نے برپا کر دیا ہنگامۂ چنگ و رباب

حق نے بخشا تھا تمہیں جوش و خروشِ جوئے آب
بن گئے تم رفتہ رفتہ صرف اک نقشِ سراب

حق نے تم کو نوعِ انساں کا بنایا تھا امام
بن گئے تم لعنتِ کوتاہ بینی سے غلام

حق نے چاہا تھا تمہیں دنیا کی شاہی کے لیے
تم نے پیہم راہیں بدلیں تباہی کے لیے

"مومن" و "مسلم" کا بخشا تھا تمہیں اس نے خطاب
"شیعہ" و "سنی" کا نازل کر لیا تم نے عذاب

اس نے رکھا تھا ہتھیلی پر تمہاری آفتاب
تم نے پنہاں کر دیا اس کو سحاب اندر سحاب

بندگی اصنام کی ٹھہرائی تھی اس نے حرام
اور تم ہر مقبرے کو جھک کے کرتے ہو سلام

دل میں ہو شرم اور ذرا یہ کیا غضب کرتے ہو تم
زندگی کا دور مردوں سے طلب کرتے ہو تم

مجھ سے آنکھیں تو ملاؤ، او اسیرانِ نفاق!
اس مہینے کو سمجھ رکھا ہے تم نے کیا مذاق؟

یہ تو ہے اے ناشناسانِ عیارِ کیف و دیں
روحِ انسانی کی آزادی کا یومِ اوّلیں

ہاں اسی دن کا ہے یہ کہ قوتِ ادراک سے
اک انوکھی بات قدرت نے کہی تھی خاک سے

ہاں اسی دن ہو گیا تھا سنگِ حق سے چور چور
آبگینے کی طرح جھوٹے خداؤں کا غرور

ہاں اسی دن قلبِ انسانی کی جانب دور سے
سنسناتا آخری ناوک کمانِ نور سے

ہاں اسی دن حق نے پھر رفعتِ نوعِ بشر
مُہرِ آخر ثبت کی تھی سرمدی منشور پر

ہاں یہ وہ دن ہے کہ درسِ حریتِ دینی ہوئی
چونک اُٹھی تھی زندگی انگڑائیاں لیتی ہوئی

ہاں اسی دن نطقِ یزداں نے کیا تھا یوں کلام
آج سے منسوخ ہے قانونِ آقا و غلام

ہاں اسی دن نے سنایا تھا یہ روحانی پیام
ابنِ آدم ماسوی اللہ کی عبادت ہے حرام

ہاں نہ جھکے نوعِ انساں ماسوا کے سامنے
اب جھکے بندہ تو صرف اپنے خدا کے سامنے

آج بھی کیا تم اسی قانون کے پابند ہو؟
چُپ ہو کیوں؟ اپنے خداؤں کی مجھے فہرست دو

مومنو! اسلام کی تائید کی تم کو قسم
بُت پرستی چھوڑ دو، توحید کی تم کو قسم

صاحبِ قرآں بنو، تعلیمِ قرآں کی قسم
اہرمن سے توڑ دو، عہدِ یزداں کی قسم

شاہِ سجدہ ور بنو، تخلیقِ آدم کی قسم
اپنے دل کی قوتِ تسخیرِ عالم کی قسم

باندھ لو سر سے کفن، شمشیرِ عریاں کی قسم
موت کا دھڑکا مٹا دو، آبِ حیواں کی قسم

اس کرے کے آخری قانون کی تم کو قسم
چونک اٹھو سبطِ نبی کے خون کی تم کو قسم

سر اٹھاؤ کشتگانِ عشق کے سر کی قسم
رن میں آ، قوتِ بازوئے حیدر کی قسم

نیند سے بیدار ہو، احساسِ کامل کی قسم
جاگ اٹھو، پیغمبرِ اسلام کے دل کی قسم

ولادتِ رسولؐ

(یہ نظم بھی حیدرآباد کی ایک محفل میلاد کے لئے نہایت عجلت میں عین وقت پر کہی گئی تھی۔)

اے مسلمانو! مبارک ہو نویدِ فتح یاب — لو وہ نازل ہو رہی ہے چرخ سے امّ الکتاب
وہ اٹھے تاریکیوں کے بامِ گردوں سے حجاب — وہ عرب کے مطلعِ روشن سے ابھرا آفتاب

گم ضیائے صبح میں شب کا اندھیرا ہو گیا
وہ کلی چٹکی، کرن پھوٹی، سویرا ہو گیا

زلف کا پیغام پھر بادِ صبا دینے لگی — پھر زبانِ گل صدائے مرحبا دینے لگی
شہپرِ جبریل کی جنبش ہوا دینے لگی — صبح لہرا کر چلی، شب راستا دینے لگی

مہر کا زرّیں سفینہ آسماں کھینے لگا
چرخ پر دریائے نور انگڑائیاں لینے لگا

خسروِ خاور نے پہنچا دیں شعاعیں دور دور — دل کھلے، شاخیں ہلیں، شبنم اڑی، چھایا سرور
آسماں روشن ہوا، کانپی زمیں، پر موجِ نور — پو پھٹی، دریا بہے، سنکی ہوا، چھلکے طیور

نورِ حق فاران کی چوٹی کو جھلکانے لگا
دلبری سے پرچمِ اسلام لہرانے لگا

گرد بیٹھی کفر کی، اُٹھی رسالت کی نگاہ　　گر گئے طاقوں سے بُت، خم ہو گئی پُشتِ گناہ
چرخ سے آنے لگی پیہم صدائے لا اِلٰہ　　ناز سے کج ہو گئی آدم کے ماتھے پر کلاہ

آتے ہی ساقی کے، ساغر آ گیا، خُم آ گیا
رحمتِ یزداں کے ہونٹوں پر تبسّم آ گیا

آ گیا جس کا نہیں ہے کوئی ثانی، وہ رسولؐ　　رُوحِ فطرت پہ ہے جس کی حکمرانی، وہ رسولؐ
جس کا ہر تیور ہے حکمِ آسمانی، وہ رسولؐ　　موت کو جس نے بنایا زندگانی، وہ رسولؐ

محفلِ سفّاکی و وحشت کو برہم کر دیا
جس نے خوں آشام تلواروں کو مرہم کر دیا

فقر کو جس کے تھی حاصل کجکلاہی، وہ رسولؐ　　گلّہ بانوں کو عطا کی جس نے شاہی، وہ رسولؐ
زندگی بھر جو رہا بن کر سپاہی، وہ رسولؐ　　جس کی ہر اک سانس قانونِ الٰہی، وہ رسولؐ

جس نے قلبِ تیرگی سے نور پیدا کر دیا
جس کی جاں بخشی نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

واہ کیا کہنا ترا اے آخری پیغامبر　　حشر تک طالع رہے گی تیرے جلووں کی سحر
تُو نے ثابت کر دیا، اے ہادیِ نوعِ بشر　　مرد یوں مُہریں لگاتے ہیں جبینِ وقت پر

گردشیں دنیا کی تیرا قصر ڈھا سکتی نہیں
آندھیاں تیرے چراغوں کو بجھا سکتی نہیں

تیری پنہاں قوتوں سے آج بھی دنیا ہے دنگ — کس طرح تو نے مٹایا امتیازِ نسل و رنگ
ڈال دی تو نے بنائے ارتباطِ جام و سنگ — بن گیا دنیا میں تحصیلِ اخوت "ذوقِ جنگ"
تیرگی کو رشکِ مہرِ درخشاں کر دیا
تو نے جس کانٹے کو چمکایا گلستاں کر دیا

یہ مسرت کا محل ہے اے عزیزِ کامگار! — تلخیٔ گفتار اس موقع پہ ہو گی ناگوار
پھر بھی ہے بزمِ طرب میں نالۂ جانِ فگار — لیکن اس کو کیا کروں دل پر نہیں ہے اختیار
آگ سی روشن ہے اک قلب و جگر کے سامنے
لے کہے دیتا ہوں جو کچھ ہے نظر کے سامنے
اس ترے انبوہ میں اے مسلمِ اندوہ گیں! — دیر سے موجود ہیں خود رحمۃ اللعالمین
زیرِ لب فرما رہے ہیں وائے بر جانِ حزیں — کوئی بھی ان میں سے اچھا ہے؟ واللہ نہیں
ذکرِ دیں ہونٹوں پہ ہے، دنیا کی گھاتیں دل میں ہیں
صبحیں چہروں پہ ہیں طالع اور راتیں دل میں ہیں
اے مرے معبود! انہیں محسوس ہو سکتا ہے کاش — شدتِ دیوانگی سے کتنے دل ہیں پاش پاش
آہ کتنوں کو ہے اک روٹی کے ٹکڑے کی تلاش — کتنے معصوموں کے چہرے دل ہیں بھوکوں سے خراش

شمع کی حاجت نہیں ہے محفلوں کے واسطے
کچھ چراغوں کی ضرورت ہے دلوں کے واسطے

کاش میرے اُمتی قرآں کا دفتر دیکھتے　　سیرتِ مقدادؓ و سلمانؓ و ابوذرؓ دیکھتے
قصۂ حسینؑ سنتے ضربِ حیدرؓ دیکھتے　　کس طرح مرتے نہیں یہ بات مر کر دیکھتے

کاش اِن کی عقل میں آتا یہ آسانی کے ساتھ
نعمتِ کونین کا رشتہ ہے قربانی کے ساتھ

ظلم سے ناآشنا محکوم حاکم سرد و خام　　روز و شب آویزشیں ہیں درمیانِ خاص و عام
ضابطہ جینے کا ہے اِن میں نہ مرنے کا نظام　　حیف تیری چپقلش پر اے گروہِ بے امام

جادہ ہے پُر پیچ منزل کا نشاں کوئی نہیں
کارواں ہے اور میرِ کارواں کوئی نہیں،

طبع میں کیا، تیغِ بُرّاں میں روانی چاہیئے
گُل فشانی تا کجا، اب خوں فشانی چاہیئے

بستۂ زنجیرِ محکومی! خبر بھی ہے تجھے؟
مہر و مہ پر تجھکو عزمِ حکمرانی چاہیئے

مرقدِ شہزادۂ اکبر سے آتی ہے صدا
حق پہ جو مٹ جائے، ایسی نوجوانی چاہیئے

شاہ فرماتے ہیں "جا لے جا خدا کے نام پر"
موت جب کہتی ہے "اکبر کی جوانی چاہیئے"

سُن کے جس کا نام نبضیں چھوٹ جائیں موت کی
دین کے ساونت کو وہ زندگانی چاہیئے

عمرِ فانی سے تو برگِ کاہ بھی ہے بہرہ مند
مرد کو ذوقِ حیاتِ جاودانی چاہیئے

کون بڑھتا ہے لہو تھوڑا سا دینے کیلئے
اے عزیزو! دین کی کھیتی کو پانی چاہیئے

جن کے سینوں میں ہو سوزِ تشنگانِ کربلا
اُن جواں مردوں کی تلواروں میں پانی چاہیئے

جوش! ذکرِ جرأتِ مولا پہ شیون کے عوض
رُخ پہ شانِ فخر و نازِ کامرانی چاہیئے

آوازۂ حق[1]

کیوں کر نہ کروں شکر خدائے دو جہاں کا
بخشا ہے مرے دل کو مزا سوزِ نہاں کا

یکساں ہے مسرت کا محل ہو کہ فغاں کا
ہونا ہے جب اِک دن تو لطف آئے جناں کا

ہوتی ہے خوشی صحت و آزار سے مجھ کو
خلعت یہ ملا ہے تری سرکار سے مجھ کو

سینے میں چھپائے ہوں جو انوار کسی کے
دل میں نہیں آتے ہیں خیالات دوئی کے

رونے کے ہوں اسباب کہ سامان ہنسی کے
جو چیز ہے ڈھل جاتی ہے سانچے میں خوشی کے

لیلائے شبِ تار ہے یا حورِ سحر ہے
جس حال میں ہوں "حسن" مرے پیشِ نظر ہے

اغیار کی نوحیں ہوں کہ احباب کی محفل
گرمی کے بگولے ہوں کہ لیلیٰ کی ہو محمل

راہوں کی صعوبت ہو کہ خوابِ سرِ منزل
ہوتا ہے ہر اک چیز سے بشاش مرا دل

صد شکر مرے دل پہ حقیقت یہ عیاں ہے
ہر آئینے میں دوست کی تصویر نہاں ہے

---

[1] یہ سلسلۂ "اسلامیات" کی غالباً سب سے پہلی نظم ہے جو شاید سنہ ۱۹۲۴ء کے آخر میں کہی گئی تھی۔ جب ترکی میں خلافت کا خاتمہ ہوا تھا اور مصنف کے نزدیک سیاسی مصلحت کی بنا پر "خلافت" کو باقی رہنا چاہیے تھا۔

ہر بات میں اک حسن ہے، ہر شے میں نفاست — بد شکل کوئی چیز نہیں ہو جو بصارت
رونا بھی ہے اک راگ جو کامل ہے سماعت — ہر اشک کے ساغر سے ابلتی ہے بشاشت

آنکھیں ہوں اگر نار میں ہے نور کا جلوہ
ہر ذرۂ ناچیز میں ہے طور کا جلوہ

ہو رنگ کا انبار کہ برسات کا دریا — وہ جھٹپٹے کی ہو دھوپ کہ بادل کا ہو پرا
وہ لو کے تھپیڑے ہوں کہ ہو لوچ صبا کا — وہ خالِ سیہ ہو کہ چمکتا ہوا تارا

اے حسن کے صانع، ترے اسرار نہاں ہیں
ہر شے میں کم و بیش کچھ انوار نہاں ہیں

شادی و الم، رنج و خوشی، مدح و مذمت — آشفتگی و عیش و طرب، درد و مصیبت
آشوب جہاں، شام بلا، صبح مسرت — سب ایک نظر آئیں جو ہو روح میں قوت

ہم دل کا اگر ساز ستاروں سے ملا دیں
گو تار بہت سے ہیں، مگر ایک صدا دیں

نالے میں ہے جو نغمۂ بلبل میں نہیں ہے — جو زلف پریشاں میں ہے سنبل میں نہیں ہے
اکثر جو ہے اعجاز کشش، کل میں نہیں ہے — کانٹے میں بھی اک شان ہے جو گل میں نہیں ہے

در پردہ یہ سب ایک ہیں ظاہر میں جدا ہیں
سب اپنے مقامات پہ تصویر خدا ہیں

پیشانیِ تشویش میں ہے جلوۂ تمکیں — تلخی میں بھی پوشیدہ ہیں کچھ جوہرِ شیریں

ہر درد کی ایذا میں ہے اک پہلوِ تسکیں — جو داغ ہے وہ دل کے لئے نارنج ہے زریں

یہ دل جو دھڑکتا ہے تو اک قسم کی گت ہے

یہ زہر میں سنتے ہیں کہ تریاق کا ست ہے

جن کی یہ تمنا ہے کہ دائم رہیں مسرور — ہیں فلسفۂ طرزِ تمدن سے بہت دور

افراطِ خوشی، غم ہے، یہ فطرت کا ہے دستور — صدموں میں رخِ راحت و آرام ہے مستور

ضو لطف کی ہے پردۂ آفات کے پیچھے

پنہاں ہے سپیدائے سحر رات کے پیچھے

دب جاتے ہیں غم سے جو خیالات ہیں اسفل — ہو جاتے ہیں انسان کے اخلاق مکمل

غم نفس کا قاتل ہے تو باطن کی ہے صیقل — مرجاتا ہے جب سانپ نکل جاتے ہیں سب بل

جی کھول کے رونا ہے علاج آنکھ کے تِل کا

ہر آہ سے کچھ زہر نکل جاتا ہے دِل کا

تکلیف کو تفریح بنا لینے کی صنعت — حاصل ہے انھیں جو ہیں پرستارِ حقیقت

آئینہ ہے اسرار کا ہر منظرِ قدرت — وہ چاند کی خُنکی ہو کہ سورج کی حرارت

مہمل ہیں یہ لفظیں "یہ بُرا ہے وُہ بھلا ہے"

جو کچھ ہے، وہ صرف ایک تبسم کی ضیا ہے

ہو دوست کے پہلو میں نشیمن تو مسرت   مل جائے اگر راہ میں دشمن تو مسرت

ہو زیرِ قدم سبزۂ گلشن تو مسرت   کانٹوں میں اُلجھ جائے جو دامن تو مسرت

تدبیر اگر وصل کی ہو رقص کی جا ہے

اور ہجر کی شب ہو تو تڑپنے کا مزا ہے

دُنیا خس و خاشاک ہے، دامن کو ہٹا لے   نازک ہے بہت دِل، غمِ ہستی سے بچا لے

اشکوں کے بخارات میں رہ دل کو سنبھالے   دانا ہے جو ہر غم میں خوشی ڈھونڈ نکالے

کب شیشۂ دل، گردِ تکدّر کے لیے ہے

ہر رنج میں آرام، بہادر کے لیے ہے

پردے کو تعین کے درِ دل سے اُٹھا دے   کثرت نہیں وحدت ہے، یہ آنکھوں سے دکھا دے

ہاں بڑھ کے حجابِ رُخِ جاناں ز ہٹا دے   میداں کو حدیں توڑ کے ہموار بنا دے

چوٹی سے چلے کوہ کی خورشید کا جلوہ

ہستی کی رگ و پے میں ہو توحید کا جلوہ

جو سعی میں سرگرم ہے دو اُس کے ہیں انجام   سرسبز ہو، یا شومیٔ قسمت سے ہو ناکام

سرسبز اگر ہو، تو مسرت کے چلیں جام   ناکام جو ہو تو بھی پیئے بادۂ گلفام

یہ دو وہ دوائیں ہیں جو یکساں ہیں اثر میں

جو یاس میں لذت ہے وہی فتح و ظفر میں

اے دوست! بتاتا ہوں تجھے روح کے اسرار　　صدموں سے اگر چور ہے تیرا دلِ بیمار

آنکھیں تو اُٹھا، دیکھ ذرا حُسن کے انوار　　یہ چاند، یہ سُورج، یہ نباتات، یہ کہسار

کیوں تیرے خیالات پریشاں ہیں برادر

اِک غم ہے تو سو عیش کے ساماں ہیں برادر

غنچوں کی حیا، گُل کی ہنسی، اوس کے گوہر　　زرتارِ شفق، سرد ہوا، باغِ معطّر

رنگین گھٹا، قوسِ قزح، مہرِ منوّر　　نغمے یہ پرندوں کے، پہاڑوں کے یہ منظر

ہے کونسی خُوبی جو سرِ نَو میں نہیں ہے

کیا باغِ ارم صبح کے پرتو میں نہیں ہے؟

ہر غم ہے، وہ راحت ہے، یقینی ہے، یہ دُنیا　　ان تنگ خیالات کے سانچے سے نکل آ

ہر فکر سے مُنہ پھیر لے، ہر رنج کو ٹھکرا　　اونچا ہو، بلندی پہ جھلک، رُوح کو چمکا

محفل میں تصوّف کی تجھے بار ملے گا

ہر سانس میں اِک مصر کا بازار ملے گا

اُترے گی ترے دل میں ضیائے رُخِ جاناں　　کانٹوں میں بھی تجھ کو نظر آئیں گے گلستاں

آنکھیں ترے تلووں سے ملینگے جن و انساں　　جنّت سے ہوا دے گا تجھے حُور کا داماں

غُل حشر میں ہوگا ہے یہ حیدر کا شرابی

آتا ہے وہ مے خانۂ کوثر کا شرابی

آزاد بھی ہو کشمکشِ سُود و زیاں سے ہاں دل کو بچا تیرگیٔ آہ و فغاں سے

لمحے جو گزرتے ہیں پھر آئیں گے کہاں سے باہر تو نکل وہم کے تاریک مکاں سے

پھیلی ہے جہاں میں رُخِ جاناں کی تجلّی

وہ دیکھ بلندی پہ ہے عرفاں کی تجلّی

اس راہِ مہمّات میں آ گر ہے جواں مرد یہ راہ ہے جس میں نہیں اُڑتی ہے کبھی گرد

چہرے کبھی اس راہ میں ہوتے ہی نہیں زرد پھولوں کی مہک آتی ہے چلتی ہے ہوا سرد

دُنیا ہے یہ وُہ جس میں فلک ہے نہ زمیں ہے

ذرّے میں یہاں وہ ہے جو سورج میں نہیں ہے

طے ہوتی ہے یاں دل کے دھڑکنے سے مسافت سائے کی نہ حاجت ہے، نہ ساماں کی ضرورت

اس راہ میں آنکھیں بھی اُٹھاؤ تو نحوست اس بزم میں گر سانس بھی لیجے تو کثافت

نسبت کچھ اِسے عالمِ ظاہر سے نہیں ہے

کچھ بحث یہاں مومن و کافر سے نہیں ہے

کیا خُوب ہیں اِس انجمنِ خاص کے دستُور بے قدر ہے جب تک کہ نہ ہو شیشۂ دِل چُور

آتا نہیں کچھ عقل میں ہوتے ہیں وہ مذکُور دوزخ میں وُہی شے ہے جو چمکی تھی سرِ طوُر

ذرّے میں جو ہے مہرِ درخشاں میں وُہی ہے

جو کفر کے سینے میں ہے ایماں میں وُہی ہے

اس بزم کے آداب ہیں سرچشمۂ حکمت — آرام سے وحشت ہے تو لذات سے نفرت
پھر جائے جو ہستی سے نظر عین سعادت — دل پھیلے پہر رات سے دھڑکے تو عبادت
ہر دن جو گزرتا ہے یہاں ایک صدی ہے
اس دائرے میں "موت" "حیات ابدی" ہے

صحت میں نہیں جس کی یہاں نقص وہ بیمار — کاموں میں جو دنیا کے ہے مشغول وہ بیکار
آنے نہیں پاتے کبھی اس بزم میں زردار — زردار کے معنی ہیں کہ محتاج ہے نادار
دولت کی حقیقت کوئی سمجھی نہیں جاتی
منعم کی یہاں بات بھی پوچھی نہیں جاتی

اس راہ میں جو یاد کرے دوست کو، غافل — اس سے یہ نکلتا ہے ابھی دور ہے منزل
معشوق سے ہر وقت جنہیں قرب ہے حاصل — کس کو وہ کریں یاد؟ بتائے کوئی عاقل
دل آہ کبھی وصل میں بھرتا ہو تو کہہ دے
اپنے کو کوئی یاد جو کرتا ہو تو کہہ دے

جن کا یہ عقیدہ ہے کہ "میں عبد وہ معبود" — اس بزم کا قانون یہ کہتا ہے "وہ مردود"
سب ایک حقیقت میں ہیں ساجد ہو کہ مسجود — ہے کفر یہ کہنا "یہ ایاز اور وہ محمود"
یاں لفظ "انا الحق" میں "انا" باعث شر ہے
اس سے یہ ٹپکتا ہے خودی پیش نظر ہے

ہر دل کو یہاں کام ہے تسلیم و رضا سے — ہر لب کو یہاں عہد ہے تسبیح خدا سے

کیا اس سے سروکار ہے بھوکے ہوں کہ پیاسے — پرہیز بڑا یہ ہے کہ نفرت ہو دوا سے

دعوت میں یہاں بھوک ہے خلعت میں کفن ہے

انعام یہاں سب سے بڑا دار و رسن ہے

اک روز ہوا شوق مرے دل میں یہ پیدا — اس راہ سے گزرے ہیں جو نام آور و یکتا

حالات بھی کچھ انکے میں دیکھوں کہ وہ تھے کیا — اس شوق میں تاریخ کے اوراق کو الٹا

فہرست میں اک نام تھا جو سب سے جلی تھا

مژدہ ہو کہ وہ نام حسینؑ ابن علیؑ تھا

قربان ترے نام کے اے سید بہادر — تو جانِ سیاست تھا تو ایمانِ تدبر

معلوم تھا باطل کے مٹانے کا تجھے گر — کرتا ہے تری ذات پہ اسلام تفاخر

سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ صداقت کا سبق تھا

تلوار کے نیچے بھی وہی نعرۂ حق تھا

شعلے کو سیاہی سے ملایا نہیں تو نے — سر کفر کی چوکھٹ پہ جھکایا نہیں تو نے

وہ کون سا غم تھا جو اٹھایا نہیں تو نے — بیعت کے لئے ہاتھ بڑھایا نہیں تو نے

دامانِ وفا گھر کے شریروں میں نہ چھوڑا

جو راستہ سیدھا تھا وہ تیروں میں نہ چھوڑا

آیا عجب انداز سے میداں میں ستمگر   ڈوبا ہوا فولاد کے ساماں میں سراسر
کف منھ میں، لہو جوش میں، غصّے سے جبیں تر   ہتھیاروں کی آواز، تو وہ زین کی چرمر
دل میں تھا غضب، نشۂ پندار تھا سر میں
اک تیغ تو تھی ہاتھ میں اور ایک کمر میں

اس طرح جو آیا وہ قریبِ شہِ ابرار   مولا نے کہا، نارِ جہنّم کے طلب گار
اب دیر مناسب نہیں، ہاں وار بس اس بار   جوہر جو دکھاتا ہوں تو بڑھ تول کے تلوار
ہم وہ ہیں کہ دشمن پہ بھی شدّت نہیں کرتے
جو حق کے پرستار ہیں سبقت نہیں کرتے

یہ سن کے بڑھا تول کے نیزہ جو وہ گمراہ   رستم کی صدا آئی کہ اَلْعَظَمَۃُ لِلّٰہ
نیزے کو ابھی اس نے گھمایا تھا کہ ناگاہ   ترچھی ہوئی اس شان سے شمشیرِ یداللہ
کم بخت کے نیزے کے لئے ضربِ فنا تھی
اس حسن سے کاٹا تھا کہ ہر پور جدا تھی

غصّے میں کماں لیکے بڑھا تب وہ ستمگار   بے رحم نے چلّے سے بڑھایا لبِ سوفار
شبّیر نے یہ دیکھ کے چمکایا جو رہوار   نیزے پہ اٹھا لائے کماں سیّدِ ابرار
ظالم نے کماں دیکھی جو نیزے کی انی پر
اک تیر سا گویا کہ لگا قلبِ شقی پر

شرمایا تو مرد بڑھا تول کے تلوار   تا دیر شہ دیں پہ تو اتر سے کئے وار
بھینسے کی طرح ہانپ رہا تھا وہ بد اطوار   حضرت نے کہا "اب مری باری ہے خبردار"
اتنی تو خبر تھی کہ چلی فرق لعیں پر
دیکھا تو اتر آئی تھی مرکب سے زمیں پر

خوں پونچھ کے حضرت نے کیا نعرۂ تکبیر   تلوار سے ہنس کر یہ کہا، واہ ری شمشیر
چلتی ہے تو رکتی نہیں دم بھر کی بھی تاخیر   کس حسن سے تو کھینچتی ہے موت کی تصویر
تو موت کا سیلاب ہے تو برق فنا ہے
پیغام اجل کا ترے دامن کی ہوا ہے

مارا گیا اس طرح جو لشکر کا نمودار   چہروں سے اڑے رنگ وہ گھبرا گئے کفّار
حضرت نے ڈپٹ کر یہ کہا "فوج بد اطوار"   بڑھتا نہیں تم میں سے کوئی کھینچ کے تلوار
سردار کے مرنے کا تمھیں درد نہیں ہے
کیا اتنے جوانوں میں کوئی مرد نہیں ہے

یہ فوج کا انبوہ، یہ میں یکّہ و تنہا   مارا ہوا صدموں کا کئی روز کا پیاسا
یہ کیا ہے کہ لاکھوں کو نہیں جنگ کا یارا؟   تُف اے سپہ شام! شجاعت وہ ہوئی کیا!
تم لرزہ بر اندام ہو عزّت گئی سب کی
تکلیف میں روحیں ہیں شجاعان عرب کی

یہ سُن کے بھی جب کوئی نہ میدان میں آیا　　خود اُن کی طرف آپ نے گھوڑے کو بڑھایا
تلوار چمکنے لگی، گرنے لگے اعدا　　دو ہو گیا کوئی، کوئی تڑپا، کوئی بھاگا
آنکھوں میں چکا چوند تھی حیراں تھے ستمگر
آپس میں مگر دست و گریباں تھے ستمگر

جس سمت جھپٹتا تھا وہ شبیرِ صفِ جنگاہ　　گر گر کے فنا ہوتے تھے وہ گھوڑوں سے بدخواہ
کُفّار میں تھا شور کہ اَلعَظَمَتُ لِلّٰہ　　آئی بھی ہیں شیروں کے مقابل کہیں رُوباہ
ترتیب صفوں میں تھی، نہ وہ شان پروں کی
برسات کا طوفاں تھا بارش تھی سروں کی

کیا جوہرِ شمشیر تھا، کیا زورِ شجاعت　　نزدیک کوئی آئے نہ پڑتی تھی یہ ہمّت
تابندہ خط و خال میں تھی برقِ امامت　　حیدر کی جو سطوت تھی تو حمزہ کی جلالت
شمشیر نہ تھی، فوج پہ بجلی کی چمک تھی
یا ابرِ سیہ تاب میں کوندے کی لپک تھی

جس سر پہ چلی پیک بے جان نظر آیا　　جس سمت گئی، خون کا طوفاں نظر آیا
اُونچی جو ہوئی، برق کا داماں نظر آیا　　نیچی جو ہوئی قبر کا ساماں نظر آیا
تلوار تھی، یا ساز، کہ نغمہ تھا اُس کا
تھا مرکزِ آوازِ فنا زیر و بم اُس کا

مصروف ابھی جنگ میں تھے حضرتِ شبیرؑ   آواز اک آئی کہ "بس اب روک لے شمشیر کا
لازم ہے کچھ اُمّت کی شفاعت کی تھی تدبیر   پی جامِ شہادت کہ بڑھے عزّت و توقیر
طوفاں سے بچا حق کو، لہو اپنا بہا دے
اُمّت کو بہادر ہے تو اب مر کے جِلا دے

جھنکار سے میدانِ وغا گونج رہا تھا   ناگاہ پئے صبر و رضا حکم جو پہنچا
یوں میان میں چلتی ہوئی تلوار کو رکھا   غُل حق و ملائک میں اُٹھا صلِّ علیٰ کا
ایمان کی ڈوبی ہوئی نبضیں اُبھر آئیں
خدمت کے لئے چرخ سے حوریں اُتر آئیں

ذرّوں پہ جو سجدے میں جھکے حضرتِ شبیرؑ   چلنے لگے ہر سمت سے تیغ و تبر و تیر
بےکس پہ چمکنے لگی شمشیر پہ شمشیر   سر پیٹ کے کہنے لگی یہ زینبِ دلگیر
چھوٹوں گی نہ اِس غم میں کبھی نوحہ گری سے
آندھی کا تصادم ہے چراغِ سحری سے

ہے ہے کوئی عبّاسؓ دلاور کو پکارو   بابا یہ بُرا وقت ہے اکبرؓ کو پکارو
اکبر نہیں ملتے ہیں تو اصغرؓ کو پکارو   بیٹے پہ چھُری چلتی ہے حیدرؑ کو پکارو
زہرا کی دہائی ہے پیمبرؐ کی دہائی
پھٹتا ہے جگر خالقِ اکبر کی دہائی

حضرت نے جو زینب کی سُنی گریہ و زاری
چُپ ہو گئے وہ قلب پہ حالت ہوئی طاری
تلواریں لگانے لگے بڑھ بڑھ کے جو ناری
مولا نے کہا شکر ہے اے ایزدِ باری
کٹتا ہے گلا بھائی کا ہمشیر کے آگے
تو بہ سرِ خاک ہے تقدیر کے آگے

تڑپے جو کئی بار زمیں پر شہِ والا
سمجھے یہ ملائک کہ قیامت ہوئی برپا
خیمے کو بڑی یاس سے مظلوم نے دیکھا
اتنے میں کسی سمت سے اک تیر وہ آیا
پامالِ صفِ لشکرِ غم ہو گئے مولا
دل میں وہ اُٹھا درد کہ خم ہو گئے مولا

رُک رُک کے جو تلوار چلی خشک گلے پر
زہرا کی صدا آئی کہ آہستہ ستم گر
حیدر نے بڑے پیار سے زانو پہ لیا سر
گردوں کی طرف دیکھ کے بولے یہ پیمبر
شکوہ نہیں نکلا مرے پیاسے کے لبوں سے
نکلی ہے مری روح نواسے کے لبوں سے

ناشاد تری بیکسی و یاس کے قرباں
نازک یہ ترا جسم ہے چھلنا ہوا میداں
ٹکڑے یہ بدن کے ہیں یہ رواحِ ہیں غلطاں
ذرّوں پہ ہیں قرآن کے اوراق پریشاں
بیکس ترے اکبر کی جوانی کے تصدق
مظلوم! تری تشنہ دہانی کے تصدق

تو اور سرِ خاک مرے گیسوؤں والے یہ دل، یہ بلائیں، یہ زباں اور یہ چھالے
اس پیاس میں گردن پہ چھُری جسم پہ بھالے افسوس ہے اے فاطمہؓ کے ناز کے پالے

عبرت کا وہ منظر ہے کہ خود ظلم خجل ہے
یہ لاش نہیں خاک پہ اسلام کا دل ہے

یہ شام کا ہنگام، یہ اندوہ، یہ میداں یہ ہُو کا سماں، اور یہ سنسان بیاباں
رانڈوں میں تلاطم ہے، اُداسی کے ہیں ساماں سوتے ہیں پڑے شام سے خیمے کے نگہباں

غم اتنے ہیں اور ایک بھی غم خوار نہیں ہے
جُز ذاتِ خدا کوئی مددگار نہیں ہے

سیدانیوں کے بیچ میں ہیں عابدِ مضطر مُنھ دیکھتی ہے سب کا سکینہ ہے وہ ششدر
ہاتھوں سے جگر تھام کے کہتے ہیں پیمبرؐ بیٹا! یہ ستمگر کی اَنی اور ترا سر

آثار ابھی تک مری اُلفت کے عیاں ہیں
اس حلق پہ اب تک مرے بوسوں کے نشاں ہیں

مصروفِ پیمبر تھے ابھی آہ و بکا میں آہستہ سے جُنبش سی ہوئی موجِ ہوا میں
آواز اک آئی کہ نہ تڑپ وحشتِ بلا میں سر رکھا ہے شبّیر کا حُوروں کی ردا میں

اس خون کو ہر خون سے ممتاز کیا ہے
ہم نے ترے بچے کو سرفراز کیا ہے

اے جوش یہ اب تک ہے اُسی خون کی تاثیر ہوتی ہے بالاعلان بڑی شان سے تکبیر
اب بھی جنہیں ملتی ہے رہِ عشق میں تعزیر صد شکر کہ خوش ہو کے پہن لیتے ہیں زنجیر

ڈرتے ہی نہیں دیکھ کے جلاّد کی صورت
زنداں میں چلے جاتے ہیں سجّاد کی صورت

اک کھیل ہے اُن کے لئے شاہوں کی جلالت سینوں میں ہے ایمان زبانوں پہ صداقت
کوشش ہے کہ آزاد ہوں پابندِ مصیبت سر جائے تو جائے، نہ گرے تاجِ خلافت

تقدیر ہے جس قلب میں ایمان کی بُو ہے
پنجاب کے ناکہ وہ گناہوں کا لہو ہے

بے درد کی حسرت کو نکلتے نہیں دیکھا کاغذ کی کبھی ناؤ کو چلتے نہیں دیکھا
ظالم کو کبھی پھولتے پھلتے نہیں دیکھا ٹھوکر ہے یہ وہ جس سے سنبھلتے نہیں دیکھا

وہ تخت ہے کس قبر میں وہ تاج کہاں ہے
اے خاک بتا، زورِ یزید آج کہاں ہے

احساس نہیں جس میں وہ تاریک ہے سینہ دوزخ میں اُترتا ہے سدا ظلم کا زینہ
پستی کے علامات ہیں، انصاف سے کینہ جو حق سے لڑا ڈوب گیا اُس کا سفینہ

ہاں پیروِ باطل کو اُبھرتے نہیں دیکھا
جب زُلف یہ بگڑی تو سنورتے نہیں دیکھا

اَے قوم! وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ اِسلام ہے پھر تیرِ حوادث کا نشانہ
کیوں چُپ ہے؟ اُسی شان سے پھر چھیڑ ترانہ تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا فسانہ

مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو
لازم ہے کہ ہر فرد حسینؑ ابنِ علیؓ ہو

یہ نظم ۱۹۱۸ء کی ہے جو غالباً ۱۹۲۰ء میں طبع ہوئی تھی۔

اِس نظم کو صرف اِس نظریہ سے پڑھا جا سکتا ہے کہ یہ آج سے اٹھارہ برس پیشتر کی چیز ہے۔

اے مومنانِ لکھنؤ

آج پھر شاعر کی آنکھوں سے ٹپکتا ہے لہو
اے محبّانِ علیؑ اے مومنانِ لکھنؤ

یہ نہیں کہتا کہ شاہنشاہ پر تم روئے کیوں
آنسوؤں سے نامۂ اعمال تم نے دھوئے کیوں

دل پہ حالت کیوں ہوئی طاری غم آورِ قوم کی
چوڑیاں کیوں کی گئیں ٹھنڈی عروسِ قوم کی

سخت حیراں ہوں مگر اے اُمّتِ بدر و حنین
دُنیوی تصویرِ غم کا شیشہ ہو خونِ حسینؑ

پختگی ایماں کی ہو مجروح وہمِ خام سے
خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں دلِ اسلام سے

رفعتیں ہنستی ہیں جس کی گنبدِ افلاک پر
تاج کا سایہ پڑے اُس کربلا کی خاک پر

حق پرستوں کی طرف سے اور یہ توہینِ حق
غیرتِ ملّت کے ماتھے سے ٹپکتا ہے عرق

ممبرِ سبطِ نبیؐ پر اور سیاسی شورشیں
مجھ سے آنکھیں تو ملاؤ سوگوارانِ حسینؑ

دین بھی اب کانپتا ہے عسکری قانون سے
تیغ کا پانی ہے بھاری کربلا کے خون سے

پیغمبرِ اسلام

نگاہِ فطرت کی ضَو سے یوں تو ہر ایک ذرّہ جھلک رہا ہے
ہر ایک قوّت اُبھر رہی ہے، ہر ایک پودا پھپک رہا ہے
دبے ہیں ذرّات کی تہوں میں ہزار اسرار کے خزانے
ازل سے آغوشِ خار وخس میں کھلے ہیں پھولوں کے کارخانے
ہوائے نشوونُما کا جھونکا ہر اک چمن سے گزر رہا ہے
ہر ایک خوشہ ہے محوِ زینت، ہر اک شگوفہ سنور رہا ہے
ازل کے دن جس طرح ملی تھی جمود کو رخصتِ روانی
مچل رہا ہے رگِ جہاں میں اُسی طرح خونِ زندگانی
اگرچہ صدیاں گزر چکی ہیں پڑے ہیں کیا کیا حجاب اب تک
مگر زمانے کے خال وخط سے ٹپک رہا ہے شباب اب تک
ادا سے چلتی ہے گلستانِ جہاں میں بادِ بہار اب بھی
زمانہ ہے رحمتوں کی تازہ نوازشوں سے دوچار اب بھی
جبینِ لیلائے شب ہے روشن روپہلی قندیل سے قمر کی
سُنہری کنگن میں ہنس رہی ہے کلائی دوشیزۂ سحر کی

عطا و انعام کے فرشتے یہاں سدا پیش و پس رہے ہیں
زمیں پہ صبحِ ازل سے اب تک کرم کے بادل برس رہے ہیں
مگر یہ سب بے شمار تحفے زمیں کو فطرت جو بخشتی ہے
کوئی حقیقی ہے اِن میں نعمت تو وہ اک آزاد آدمی ہے
وہ آدمی، موجِ زندگی سے نگاہ جس کی دُھلی ہوئی ہے
وہ آدمی جس کے ہر نفس میں کتابِ حکمت کھلی ہوئی ہے
وہ آدمی جس کی تیز نظریں، مزاجِ عالم کی راز داں ہیں
وہ آدمی نبضِ پیچ و تابِ حیات پر جس کی انگلیاں ہیں
وہ آدمی، جس کا جامِ اُلفت، خنک ستارے پیئے ہوئے ہیں
وہ آدمی، گرد و پیش جس کے فرشتے حلقہ کیے ہوئے ہیں
وہ آدمی، جس کے پاک دل میں پیامِ فطرت چھپا ہوا ہے
وہ آدمی، جس کا گرم ناخن رُبابِ ہستی کو چھیڑ رہا ہے
وہ آدمی، جو شمیمِ گُل سے علوم کے پھول چن رہا ہے
وہ آدمی، جو ہوا کی رَو میں خدا کا پیغام سُن رہا ہے
اگرچہ نقشِ قدم پر اُس کے ازل سے سجدے میں آسماں ہیں
مگر غضب تو یہ ہے جہاں میں اُسی سے بے اعتنائیاں ہیں

بہت سے گزرے ہیں یوں تو انساں خرد کی شمعیں جلانے والے
بتوں کی ہیبت اٹھانے والے، خدا کا سکّہ بٹھانے والے
مگر عرب کے خموش افق سے کرن وہ پھوٹی رسول بنکر
کہ جتنے ظلمت کے خار و خس تھے دہک اٹھے سرخ پھول بنکر
ابھی تک انکار پر مصر ہے، دماغ مختل ہے کافری کا
نظامِ قدرت سے ہے نمایاں ثبوت اس کی پیمبری کا
کوئی فلاحت کا ہے وہ ماہر؟ کہ یہ حقیقت کرے ہویدا
کہ خار کے تخم نے کیا ہے کئی صدی میں گلاب پیدا
کوئی نظیر اس کی مل سکے گی؟ کہ آگ پانی سے جل سکی ہے
زمین چھٹکا سکی ہے تارے؟ چٹان موتی اگل سکی ہے
کبھی کوئی جنس اپنی ضد کی طرف بتا دو اگر پھری ہے؟
کلی سے شعلے کبھی اٹھے ہیں؟ شرر سے شبنم کبھی گری ہے؟
دیارِ باطل کے کارواں کو سراغِ دین و ملل ملا ہے؟
کسی کو خشکی کا بیج بو کر کبھی سمندر کا پھل ملا ہے؟
سرشت جو خشت کی نہ سمجھے، مزاج جو سنگ کا نہ جانے
زبان اس کی سنا سکے گی ستون و محراب کے فسانے؟

وہ خُفتہ معمار، جو نہ جانے کہ فنِ تعمیر کیا بلا ہے
محل کا کیا ذکر، اِک گھروندا بھی زندگی میں بنا سکا ہے؟
بنا سکے گا بھی وہ اگر کچھ، نہ رہ سکے گا نشان اُس کا
رہے گا مٹی کا ڈھیر ہو کر ضرور اِک دِن مکان اُس کا
اِسی طرح وہ، جو دوسروں کی بہارِ حکمت کا خوشہ چیں ہے
اِسی طرح وہ، جو کہہ رہا ہے "نبی ہوں" لیکن نبی نہیں ہے
وہ ایک پَودا ہے باغِ عالم میں جو مُسلسل نہ پھَل سکے گا
کبھی اُس آشفتہ سر کا مذہب جہاں میں صدیوں نہ چل سکے گا
بھلا یہ ممکن ہے کذب پر ہو مدار اِک دینِ مستقل کا؟
گراں بہا وقت کی جبیں پر نشاں ہو اِک پائے مضمحل کا
دروغ، اور یہ فروغ پائے، دلوں پہ حاصل ہو بادشاہی!
اور اُس کی حقّانیت پہ صدیوں کروڑوں اِنسان دیں گواہی
یہ ہم نے مانا کہ جھُوٹ کو بھی فروغ ہوتا ہے لیکن اتنا
کہ تک شگوفوں سے چھیڑ کرتا، گزر گیا اِک ہوا کا جھونکا
مگر وہ ہستی جو آج لاکھوں خُدا کے بندوں کی حرزِ جاں ہے
وہ محض اِک شعبدہ ہو! ناداں! ترا فراست تری کہاں ہے

سراب کو لاکھ کوئی پوجے، پر ایک قطرہ نہ پی سکے گا
یہ یاد رکھو دروغ صدیوں نہ جی سکا ہے، نہ جی سکے گا

خدا کے وہ بے شمار بندے کہ مستحق ہیں نوازشوں کے
رہیں وہ صیدِ زبوں مسلسل ذلیل و ناپاک سازشوں کے!

اگر یہ ہم مان لیں کہ دنیا طلسم خانہ ہے شیطنت کا
مذاق اڑانا پڑے گا ہم کو خدا کے ذوقِ ربوبیت کا

دروغ میں سب سے ہو جو بڑھ کر، وہی خدائی کا رہنما ہے
اگر یہ سچ ہے تو پھر خدا کا جلال محض اک ڈھکوسلا ہے!

سنو! کہ جھوٹا کبھی نہ ہوگا جو دل میں رکھتا ہے کوئی جوہر
اگر ہے شک تو نگاہ ڈالو خصوصیاتِ پیمبری پر

وہ روحِ انبیا کہہ سکیں ہم جسے اک آئینِ مستقل کی
ہمیشہ ڈوبی ہوئی ملے گی خموشی گہرائیوں میں دل کی

بقائے انسانیت کی خاطر جو قلب، جو پائے راز ہوگا
نظامِ تخلیق و روحِ عالم سے محوِ راز و نیاز ہوگا

وہ پاک ہستی، جو نوعِ انساں کی فکر میں بے قرار ہوگی
بشر کی پنہاں ترین حس سے نگاہ اس کی دوچار ہوگی

سدا منقش ہیں اُس کے دل پر عظیم اشکالِ آسمانی
ہمیشہ پیشِ نظر ہے اُس کے کشاکشِ مرگ و زندگانی
جلاتا رہتا ہے تازہ شمعیں وہ ہر نفس بزمِ آب و گِل میں
سوالِ علم و عمل کا شعلہ لرزتا رہتا ہے اُس کے دل میں
جو ان حقائق میں غرق ہوگا، بھلا وہ حد سے گزر سکے گا؟
جو رازِ فطرت سے آشنا ہو، وہ جھوٹ برداشت کر سکے گا؟
پس ان دلائل کی روشنی میں ضرور یہ ماننا پڑے گا
کہ ہے پیامِ خدائے برتر، پیام پیغمبرِ عرب کا
سُنے ہوئے اس پیامِ حق کو اگرچہ صدیاں گزر چکی ہیں
بہت سی قومیں اُبھر کے ڈوبیں، ہزاروں جی جی کے مر چکی ہیں
مگر حروف اس کے ہیں کہ اب تک اسی طرح سے جھلک رہے ہیں
ہر ایک نقطے میں زندگی کے ہزاروں شعلے بھڑک رہے ہیں
کبھی تو کر غور اپنے جی میں کہ اس روش میں یہ بات کیوں ہے؟
اگر یہ شے مبنی حق نہیں ہے تو پھر یہ رنگِ ثبات کیوں ہے؟
اگر یہ مصحف نہیں، تو ہاتھوں پہ کیوں مثبت لئے ہوئے ہے؟
اگر غلط ہے تو کیا خدا کا جلال سازش کئے ہوئے ہے؟

اگر یہ بے جان مسئلہ ہے تو زندگی کا یہ جوش کیوں ہے؟
اگر یہ تکذیب کا ہے شایاں، زبانِ فطرت خموش کیوں ہے؟
جو جانچنا ہے تو کیوں نہ پھر ہم ہر ایک پہلو کو دیکھیں بھالیں؟
نبوتِ پیغمبری کی خاطر عرب پہ آؤ نگاہ ڈالیں!
عرب، وہ ریگِ رواں کا عالم، سراب کی ہولناک دنیا!
وہ سُرخ ذرات کا سمندر، تپش کا وہ خوفناک صحرا!
وہ مسندِ بُو قبیس و فاراں، وہ مسند و تختِ شاہِ خاور
جہانِ جنگ و جدال و غارت، مقامِ تیغ و سنان و خنجر
حدودِ امن داماں سے باہر، لباسِ شائستگی سے عاری
گرج سے افلاک زلزلے میں، کڑک سے لرزاں زمین ساری
سفید، اندیشۂ دغا سے، سیاہ گردِ مبارزت سے
برادری سے جہاں کی خارج، الگ شعارِ معاشرت سے
زمینِ فتنہ، دیارِ شورش، مقامِ گریہ، محلِّ زاری
نہ علمِ ظاہر، نہ نُورِ باطن، نہ حُبِّ انساں، نہ خوفِ باری!
وہ گرم پست و بلند ٹیلے، وہ ہولِ بادِ سموم و طوفاں
وہ رُعب و جبروتِ شاہِ خاور، وہ بُخل و امساکِ ابرِ باراں

درّوں میں وہ ایک دبدبے سے قطارِ اُشتر قدم جمائے
اِدھر اُدھر وہ جبالِ سرکش، غرور سے گردنیں اُٹھائے
غضب ہے آبادیوں کے باہر، اُدھر دہکتی ہوئی چٹانیں
ستم ہے آبادیوں کے اندر، اِدھر کڑکتی ہوئی کمانیں
یہ مُلک، اور اِک یتیم بچّہ، نہ کوئی وارث، نہ کوئی والی
سرہانے اِک پیرِ سال خوردہ، اسیرِ صد ضعف و خستہ حالی
نہ باپ سر پر، نہ ماں کا سایہ، بلا نصیب و ستم رسیدہ
مقامِ حیرت کا رہنے والا، نہ شاد و فرحاں، نہ آبدیدہ
کتاب سے نابلد معرّا، فیوضِ تعلیم و تربیت سے
کُھلیں جو آنکھیں تو بند پائی مدد کی ہر راہ شش جہت سے
پلا ہو بے باپ کا جو بچّہ اعرب میں اور پھر اِس ابتری سے
اگر پیمبر نہیں، تو واقف ہوا وہ کیونکر پیمبری سے
پیامِ بیگانۂ تمدّن، بنائے تہذیب ڈالتا ہے؟
دماغِ پروردۂ بیاباں، جہاں کو سانچے میں ڈھالتا ہے؟
وہ طفل، پروان جو چڑھا ہو دیارِ اصنامِ آذری میں
صدائے توحید سے وہ ڈالے شگاف محرابِ کافری میں

اگر صدا اِس نبیِ اُمّی کی آسمانی صدا نہیں ہے
تو پھر کہاں سے یہ فیض پہنچا؟ جواب اِس بات کا نہیں ہے

عرب کے ہیرو، عجم کے سُلطان، نظامِ ارض و سما کے والی
زمیں پہ لطف و کرم کی تُو نے عجب بنائے لطیف ڈالی

چلا جو دوشِ صبا پہ تیرا پیام ابرِ بہار بن کر
تمام باطل کے سنگریزے مہک اُٹھے برگ و بار بن کر

مشیّتِ ایزدی کے دِل سے بنا ہے شاید دماغ تیرا
وگرنہ کیوں طاقِ بادِ صرصر میں جل رہا ہے چراغ تیرا

دیے ہیں سینے میں زندگی کے بہشت سے جو ہر اُبھرنے والے
اِدھر بھی ہاں اِک نظرِ خُدارا دِلوں کے بیدار کرنے والے

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیِ مئے ناب و سفینۂ غزل است
(حافظ)

(۱)

جدید رنگِ تغزّل

دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے — اسلوبِ سخن نیا نکالا ہم نے
ذرّات کو چھوڑ کر حریفوں کے لئے — خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا ہم نے
(مصنف)

(۱۹۲۶ء کے بعد کی غزلیں)

صبح، بالیں پہ یہ کہتا ہوا غم خوار آیا
اُٹھ کہ فریاد رسِ عاشقِ بیمار آیا

بختِ خوابیدہ گیا ظلمتِ شب کے ہمراہ
صبح کا نور لئے دولتِ بیدار آیا

خیر سے باغ میں پھر غنچۂ گلرنگ کھلا
شکر ہے دور میں پھر ساغرِ سرشار آیا

جھوم اے تشنۂ گلبانگِ نگارِ عشرت
کہ لبِ یار لئے چشمۂ گفتار آیا

شکرِ ایزد کہ وہ سرخیلِ مسیحا نفساں
زلف بر دوش پئے پرسشِ بیمار آیا

رخصت اے شکوۂ قسمت! کہ سرِ بزمِ نشاط
ناسخِ مسئلۂ اندک و بسیار آیا

للّٰہ الحمد کہ گلزار میں ہنگامِ صبوح
حکمِ آزادیٔ مرغانِ گرفتار آیا

غنچۂ بستہ! چٹک، جاگ اُٹھی موجِ صبا
شعلۂ حسن! بھڑک، مصر کا بازار آیا

خوش ہو اے عشق کہ پھر حسن ہوا مائلِ ناز
مژدہ اے جنسِ محبت! کہ خریدار آیا

اے نظر! شکر بجا لا کہ کھلی زلفِ دراز
اے صدف! آنکھ اُٹھا، ابرِ گہربار آیا

بادباں! ناز سے لہرا کہ چلی بادِ مراد
کارواں! عید منا، قافلہ سالار آیا

خوش ہو اے گوش! کہ جبریلِ ترنّم چہکا
مژدہ اے چشم! کہ پیغمبرِ انوار آیا

خوش ہو اے پیرِ مغاں! جوش میں ہو نغمہ فروش
مژدہ اے دخترِ رز! رندِ قدح خوار آیا

اے حُسن! اگر عشق خریدار نہ ہوتا — یہ غلغلۂ گرمیِ بازار نہ ہوتا

نالوں سے مرے چرخ اگر گونج نہ اُٹھتا — یہ زمزمۂ نُطقِ گُہربار نہ ہوتا

غم سے مرے چہرے پہ اگر خاک نہ اُڑتی — یہ فتنۂ رنگِ لب و رخسار نہ ہوتا

انکار کو شاعر نہ سمجھتا اگر اقرار — اقرار میں یُوں پہلوئے انکار نہ ہوتا

آتی نہ اگر مجھ کو جماہی پہ جماہی — یہ میکدۂ نرگسِ بیمار نہ ہوتا

میں آہ نہ بھرتا تو ترے لعلِ نگاریں — گُل بیز، گُل افشاں و گُہربار نہ ہوتا

میں شوقِ شہادت میں اگر سر نہ جھکاتا — یہ عُربدۂ چلتی ہوئی تلوار نہ ہوتا

یہ تاب و تبِ مشعلِ انداز نہ ہوتی — یہ طنطنۂ طرّۂ طرّار نہ ہوتا

یہ برہمیِ گیسوئے شب رنگ نہ ہوتی — یہ پیچ و خمِ کاکُلِ خمدار نہ ہوتا

عشووں کو نہ ملتا کبھی یہ منصبِ عالی — انداز بایں قیمت و مقدار نہ ہوتا

اس مستیِ رفتار سے اس لغزشِ پا سے — سویا ہوا فتنہ کوئی بیدار نہ ہوتا

دنیا نہ اگر تاج و کمر تجھ کو دلِ جوش
کونین کا تُو مالک و مختار نہ ہوتا

صبر کر اے دل کہ پھر وہ شاہِ خوباں آئے گا
پھر ترے پہلو میں یارِ فتنہ ساماں آئے گا

یوں نہ آہیں بھر کہ پھر اس خلوتِ خاموش میں
اک نہ اک دن یارِ رقصاں و غزلخواں آئے گا

جانِ من اے نا عاقبت اندیش اردو کر نہ دے
کیا کہے گا پیش جب وہ مالکِ جاں آئے گا

دھو نہ بام و در کی نقاشی کہ پھر اس قصر میں
گنگناتا قاصدِ شمعِ شبستاں آئے گا

شل نہ کر شانوں کو ماتم سے کہ کل اس راہ میں
لہرکھاتا کاروانِ زلفِ پیچاں آئے گا

سرو و سنبل کی نگہداری سے غافل ہو شیار
اس چمن میں پھر پیامِ ابرِ باراں آئے گا

سبزۂ خوابیدہ کو سرسبز کر اے باغباں
پھر پئے گل گشت وہ سروِ خراماں آئے گا

سرنگوں ہیں گل تو کیا پروا کہ پھر وہ لالہ رخ
صد گلستاں برکف و صد گل بداماں آئے گا

توبہ توبہ کر اے جوشِ فرشِ بادہ خواری توبہ توبہ کر
کل یہیں گردش میں پھر جامِ زر افشاں آئے گا

صد شکر کہ پھر زیست کا ساماں نظر آیا
پھر در پہ کوئی فتنۂ دوراں نظر آیا

پھر رطلِ گراں مست ہوا نکہتِ مے سے
پھر ذوقِ طرب سلسلہ جنباں نظر آیا

پھر کاکلِ ژولیدہ سے جھلکا رخِ رنگیں
پھر ابر کے سائے میں گلستاں نظر آیا

اشکوں کی جھڑی بند نہ ہوتی تھی کسی طرح
صد شکر ترا گوشۂ داماں نظر آیا

لو کاکلِ شب تنگ کھلی کھل گئیں آنکھیں / اُڑتا ہوا رنگِ شبِ ہجراں نظر آیا

بشاش ہو جمعیّتِ خاطر کی تمنّا! / لے سلسلۂ زلفِ پریشاں نظر آیا

اب تک نہ خبر تھی مجھے اُجڑے ہوئے گھر کی / تم آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا

انگڑائیاں لیتا کوئی اے جوشؔ دمِ صُبح
خورشید سے پھر دست و گریباں نظر آیا

گرم پھر شکر ہے اخلاص کا بازار ہوا / پھر نیا عہدِ میانِ دل و دلدار ہوا

للہ الحمد کہ گلشن میں پھر اک عمر کے بعد / جشنِ گُل پوشیِ رندانِ قدح خوار ہوا

طے ہوئی پھر خلشِ شام و سحر کی منزل / عام پھر غُلغلۂ کاکُل و رخسار ہوا

منصبِ تازہ پہ فائز نہ ہو کیوں رُوحِ نیاز / صید کے دام میں صیّاد گرفتار ہوا

کاروانِ دلِ برباد کا، صد شکر، کہ پھر / غمزۂ ہوش رُبا، قافلہ سالار ہوا

اُفقِ ذوقِ سماعت پہ ہیں آثارِ طلوع / کہ لبِ لعل پھر آمادۂ گفتار ہوا

نرخ وہ چند کر اے حسرتِ شرحِ آلام! / کہ وہ پھر حرف و حکایت کا خریدار ہوا

کل تھے اقرار کے پردے میں ہزاروں انکار / آج انکار کے انداز سے اقرار ہوا

آرزو وجد میں ہے دُھوم ہے ارمانوں میں
کہ وہ پھر جوشؔ کی تائید پہ تیّار ہوا

محفلِ عشق میں وہ نازشِ دوراں آیا
اے گدا خواب سے بیدار کہ سلطاں آیا

اے کلی! ناز سے کھل، بادۂ سرجوش اُبل
کہ نگارِ چمن و شاہدِ مستاں آیا

دُور اے زُہد! کہ وہ زہد شکن آ پہنچا
رخصت اے ایماں! کہ وہ غارتگرِ ایماں آیا

خاطرِ جمع سے ہشیار، کہ برہم ہوئی زُلف
کشتیٔ دل سے خبردار کہ طوفاں آیا

بوستاں وجد میں آ، عشق! غزلخواں ہو جا
کہ گُلِ سرسبد و سروِ خراماں آیا

اے چمن! عید منا، ابر ہوا گرمِ خرام
اے صبا! ناز سے چل، موسمِ باراں آیا

مژدہ اے کارگرہ بستہ، کہ ہمراہِ نسیم
پیکِ مشکینِ نفس کاکُلِ پیچاں آیا

شاد باش اے سحرِ عید، کہ بالیں پہ مری
بارہا سلسلۂ زُلفِ پریشاں آیا

کج کلاہی کا سرو برگ مبارک اے جوشؔ
لے، پیامِ شکنِ طرّۂ جاناں آیا

برہم اے سلسلۂ زلفِ پریشاں ہو جا
رنگِ طرفِ چمن و ابرِ بیاباں ہو جا

کارواں سُست قدم اور بیاباں درپیش
جرسِ قافلۂ بے سر و ساماں ہو جا

تجھ کو لب تشنگیِ اہلِ وفا کی سوگند
اے لبِ عطر فشاں! چشمۂ حیواں ہو جا

اے مرے سروِ سہی! اے موجِ نسیمِ سحری!
فتنۂ گلشن و آشوبِ نیستاں ہو جا

کثرتِ زخم سے اک باغ ہے قلبِ انساں
تجھ کو اس باغ کی سوگند گلستاں ہو جا

وقت ہے وقتِ گُل افشانی و گل بیزی کا
آج گلشن بکف و خُلد بداماں ہو جا

اپنی رفتار پہ ہے کوثر و تسنیم کو ناز
کاکُلیں چھوڑ کے شانوں پہ خراماں ہو جا

جوش آیا ہے گلستاں میں پئے رامشِ رنگ
اے کلی! پھُول بن، اے پھُول گلستاں ہو جا

گزر رہا ہے ادھر سے تو مسکراتا جا
چراغِ مجلسِ روحانیاں جلاتا جا

اٹھا کے ناز سے شب آفریں نگاہوں کو
کسی کی سوئی ہوئی رُوح کو جگاتا جا

نگاہِ مہر سے لے آفتابِ عالمِ پاک
حقیر خاک کے ذرّوں کو جگمگاتا جا

ملا کے مجھ سے نظر، عزّتِ جنوں کی قسم
چراغِ محفلِ عقل و خرد بجھاتا جا

اسیر کر کے سیہ کاکلوں کے حلقے میں
کمندِ عقلِ تنک مایہ سے چھڑاتا جا

اٹھا کے عارضِ گلگوں سے دو گھڑی کو نقاب — نظر سے ارض و سما کا حجاب اٹھاتا جا

مزاج پوچھ کے اے شاہِ عارض و کاکل — گدائے راہ کی بھی آبرو بڑھاتا جا

اگر یہ لطف گوارا نہیں تو مستِ خرام!

جبینِ جوشؔ پہ ٹھوکر ہی اِک لگاتا جا

ارض و سما کو ساغر و پیمانہ کر دیا — رِندوں نے کائنات کو میخانہ کر دیا

اے حُسن! داد دے کہ تمنّائے عشق نے — تیری حیا کو عشوۂ تُرکانہ کر دیا

قرباں ترے کہ اک نگہِ التفات نے — دل کی جھجک کو جرأت رندانہ کر دیا

صد شکر درسِ حکمتِ ناحق شناس کو — ہم نے رہینِ نعرۂ مستانہ کر دیا

دُنیا نے ہر فسانہ "حقیقت" بنا دیا — ہم نے حقیقتوں کو بھی "افسانہ" کر دیا[1]

آواز دو کہ جنسِ دو عالم کو جوشؔ نے

قربانِ یک تبسّمِ جانانہ کر دیا

---

[1] بعض بعض مقامات پر ردیف "کر دیا" کو "بنا دیا" کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ میں اپنے آپ کو ان بے جا قیود کا پابند نہیں سمجھتا۔ — جوشؔ

میں دین و دلِ عشق ہوں ایمانِ تمنّا
اُترا ہے مری رُوح پہ قرآنِ تمنّا

کیونکر نہ کرے دعوئے پیغمبریٔ عشق
حاصل ہو جسے دولتِ عرفانِ تمنّا

ہنستا ہوا گزرا ہوں میں طوفانِ اجل سے
سینے میں لئے چشمۂ حیوانِ تمنّا

اِک حرف بھی دھویا نہ گیا وقت سے اب تک
کیا بات ہے اے کاتبِ دیوانِ تمنّا

صرف ایک شکن میں ہے نہاں عرصۂ کونین
اللہ رے اے وسعتِ دامانِ تمنّا

جو باعثِ ایجاد ہے اُس ذات کی سوگند
ناقابلِ تسلیم ہے پایانِ تمنّا

جب تک کہ محبت کی ہے دُنیا کو ضرورت
دستِ منِ دیوانہ و دامانِ تمنّا

ہر شب مری سرکار میں آتے ہیں فرشتے
ہاتھوں پہ لئے شمعِ فروزانِ تمنّا

کونین کے سینے میں تلاطم سا بپا ہے
اللہ ری پُر افشانیٔ مژگانِ تمنّا

ہاں پھیر اِدھر بھی کہ ہو تازہ مرا ایماں
یہ رُوئے کتابی کہ ہے قرآنِ تمنّا

ممکن ہو تو صرف ایک نظر حالِ گدا پر
اے شاہِ دلِ عالم و سلطانِ تمنّا

اِک جوشؔ کا دل ہی نہیں خود گوئے دو عالم
غلطیدہ ہے پیشِ خمِ چوگانِ تمنّا

جب دل نے مجھ کو شعلہ بداماں بنا دیا — میں نے ہر ایک خار کو بستاں بنا دیا

اُس پچھلی رات کو جسے کہتے ہیں کم سنی — میری نظر نے صبحِ درخشاں بنا دیا

اے حُسن! شاد ہو کہ تجھے چشمِ شوق نے — آشوبِ خلق و فتنۂ دوراں بنا دیا

پنہاں تھیں جس میں رُوح کی گہری خموشیاں — اُس جُنبشِ نظر کو غزل خواں بنا دیا

زلفوں کی ہر گرہ کو عطا کی متاعِ دل — اَبرو کی ہر شکن کو رگِ جاں بنا دیا

جلووں کو دیں نظامِ دو عالم کی وسعتیں — شوخی کو کائنات بداماں بنا دیا

عشووں کی غنچگی کو عطا کی شگفتگی — شبنم کی بُوند کو دُرِ غلطاں بنا دیا

غمزے کے "اشتباہ" کو بخشا "یقینِ ناز" — "وہمِ شرر" کو شعلۂ عریاں بنا دیا

فیضِ نگاہِ عشق نے اے دوستِ جمال! — تیرے ہر ایک جزو کو قرآں بنا دیا

خالِ سیہ کو بخش کے مُہرِ پیمبری — زُلفوں کی مَوجِ کفر کو ایماں بنا دیا

اے ناز! داد دے کہ سرابِ جمال کو — میری نظر نے چشمۂ حیواں بنا دیا

اے حُسن! شکر کر کہ ملی تجھ کو خسروی — اے چشمِ ناز کر کہ تجھے جاں بنا دیا

کج کر کلاہِ فخر کہ تیرے شباب کو — میں نے خدائے عالمِ امکاں بنا دیا

لیکن بایں ہمہ ترا احساں ہے جوش پہ
دل کو دیئے وہ داغ کہ انساں بنا دیا

وفا شعار ہوں ترکِ وفا نہیں کرتا
کبھی نمازِ صبوحی قضا نہیں کرتا

وہ کون عربدہ جو ہے جو میرے دل کیا کہئے
حقوقِ مہر و محبت ادا نہیں کرتا

وہ کون منظرِ قدرت ہے آج عالم میں
جو میرے واسطے آغوش وا نہیں کرتا

ہزار بار کیا عہد اُس نے مجھ سے وفا
جو ایک بار بھی وعدہ وفا نہیں کرتا

خدا کرے کبھی رندوں کے سامنے آئے
فقیہہ شہر کہ ترکِ ریا نہیں کرتا

جزائے خیر کا اس بیخودی پہ طالب ہوں
کہ میں تصوّرِ یومِ جزا نہیں کرتا

ہزار بار کیا عہدِ ترکِ صہبا کا
مگر تبسمِ ساقی خطا نہیں کرتا

گماں تو جوشؔ یہی ہے کہ ہے گدا ناقص
نہ یہ کہ شاہ، خیالِ گدا نہیں کرتا

اگر گیسو بدوش آنا نہیں اچھا تو یونہیں آجا
کسی دن تیغ بردست و کفن در آستیں آجا

حرم ہو، مدرسہ ہو، دیر ہو، مسجد کہ مے خانہ
یہاں تو صرف جلوے کی تمنّا ہے کہیں آجا

سرِ راہِ طلب ہر گام ہے اک منزلِ تلخی
کبھی ان تلخیوں میں مثلِ موجِ انگبیں آجا

بڑے دعوے ہیں اہلِ انجمن کو صبر و تمکیں کے
کبھی جلوت میں بھی اے فتنۂ خلوت نشیں آجا

اذانیں ابر پیما ہیں تو سجدے آسماں فرسا
ذرا مسجد میں بھی اے دشمنِ ایمان و دیں آجا

چلا ہے سوئے حرمِ دل سے ساز کرتا جا　　طوافِ کعبۂ حسنِ مجاز کرتا جا

ملے جو وقت تو اے رہروِ رہِ اکسیر　　حضیرِ خاک سے بھی ساز باز کرتا جا

فراغِ رازِ مسرت کے ڈھونڈنے والے　　شبوں کو محرمِ سوز و گداز کرتا جا

بلند و پستِ جہاں کے، ارے معاذ اللہ　　یہیں سے سیرِ نشیب و فراز کرتا جا

تلاشِ جادۂ بے پیچ و خم سے قبل اے دوست!　　تجسسِ خمِ زلفِ دراز کرتا جا

اگر جبیں کو ہے ذوقِ حریمِ بے رنگی　　بساطِ رنگ پہ مشقِ نماز کرتا جا

چلا ہے خدمتِ یارِ درست پیماں میں　　پرستشِ صنمِ حیلہ ساز کرتا جا

وہاں جمال کو فرصت نہیں توقف کی　　یہیں سے دیدۂ باطن کو باز کرتا جا

مثالِ جوششِ اسی آب و گل کے عالم سے
نظر کو خوگرِ طغیانِ ناز کرتا جا

نہ جانے رات کو کیا میکدے میں مشغلہ تھا　　کہ ہر نفس میں قیامت کا جوش و ولولہ تھا

نگاہِ یار کی یوں اُٹھ رہی تھی جھک جھک کر　　زمین رقص میں تھی، آسماں پہ زلزلہ تھا

لرز رہے تھے شگوفے تڑپ رہے تھے نجوم　　چھڑا ہوا نہیں معلوم کون مسئلہ تھا

کبھی ہلال چمکتا تھا، اور کبھی خنجر　　میانِ عشق و جوانی عجیب مرحلہ تھا

تپاں تھا دائرۂ خاک و عالمِ ارواح　　نیاز و ناز میں کیا جانے کیا معاملہ تھا

زباں پہ آئیں تو ہر حرف سے لہو ٹپکے　　ہر ایک سانس میں ان ولولوں کا قافلہ تھا

دلِ نگار میں تھی کچھ لطیف گفت و شنود　　نہ جانے شکرِ کرم تھا کہ شکوہ و گلہ تھا

اُدھر تھی لرزشِ صہبا، اِدھر خرامِ نگار　　نرالی بحث چھڑی تھی نیا مقابلہ تھا

بساطِ خاک سے تا اوجِ ثابت و سیار　　شمیمِ کاکلِ عنبر فشاں کا سلسلہ تھا

ترانہ ریز تھی نبضِ حیات کی جُنبش　　ضمیرِ شب میں وہ پنہاں خروش و ولولہ تھا

ہزار شکر ذرا بھی کمی نہ کی اے جوشؔ
اگرچہ دیکھنے میں یار تنگ حوصلہ تھا

دورِ بے بینی و جوانی، یہ تماشا کیسا؟ — عیشِ امروز کے طوفان میں فردا کیسا؟
اُس زمانے میں کہ ہو جامہ دریِ جیبِ ایماں — راہ میں خار سے دامن کا بچانا کیسا؟
مہ وشوں کے نفسِ عطر فشاں کے ہوتے — ذکرِ جاں بخشیِ انفاسِ مسیحا کیسا؟
سر پہ جس وقت گرجتے ہوں جنوں کے بادل — پختہ کاری کی صدا، عقل کا غوغا کیسا؟
رامش و رنگ کی گونجی ہوئی آواز دل میں — قصّۂ جنّت و افسانۂ عقبیٰ کیسا؟
اُس زمانے میں کہ ہر ذرّہ ہو جب جاذبِ دل — نرگسِ ناز کے دھوکے میں نہ آنا کیسا؟
ہوں جہاں قلقلِ مینا سے ترانے ہمدوش — اُس جگہ کوثر و تسنیم کا چرچا کیسا؟
جس شبِ ماہ میں ہو بربط و فرشِ سنجاب — اُس شبِ ماہ میں تسبیح و مصلّا کیسا؟

جوشؔ باغی ہے مشیّت کا جوانِ صالح
موسمِ کفر میں اسلام کا دعوےٰ کیسا؟

پھر تابِ رُخ سے ذوقِ نظر بہرہ ور ہے آج — پھر ہر نگاہ، مرہمِ زخمِ جگر ہے آج
پھر سینۂ زمیں سے اُبلتا ہے سیم و زر — پھر آسماں سے بارشِ لعل و گہر ہے آج
پہلوئے شوق میں گہرِ پاکِ آرزو — پھر جوشِ انبساط سے پاکیزہ تر ہے آج
آنکھوں کے پردہ ہائے سُبک سے ہے عکسِ رُخ — دریا کی نرم سطح پہ رقصِ گہر ہے آج

پھر دل، صدائے چنگ سے ہے گرمِ اختلاط   پھر روح موجِ نغمہ سے شیر و شکر ہے آج
پھر دیدۂ نیاز میں غلطاں ہے عکسِ ناز   پھر بزمِ حس میں برقِ تپاں جلوہ گر ہے آج
پھر یوں جبینِ ناز پہ بکھری ہیں کاکلیں   تو یہ کہے کہ ابرِ محیطِ قمر ہے آج
پھر بج رہا ہے محفلِ عشرت میں دائرہ   پھر اشکِ گرم حلقۂ بیرونِ در ہے آج
پھر سر پہ تیرہ ابر کی رَو ہے بطرزِ نَو   پھر دل میں رقصِ دردِ برنگِ دگر ہے آج
سینے میں چبھ رہی ہے پھر آوازِ پائے یار   دل پھر خرامِ ناز سے زیر و زبر ہے آج
پھر حسن کی جھلک سے جھپکتی نہیں نظر   پھر ساز گار شمع کو نورِ سحر ہے آج

پھر سُن رہا ہے کوئی سہی قد کلامِ جوشؔ
پھر عرش پر دماغِ متاعِ ہنر ہے آج

اِدھر بھی بادِ صبا! آ بہار کی سوگند   شمیمِ طرۂ گیسوئے یار کی سوگند
چھڑا دو رنگیٔ امید و بیم سے دل کو   طلسمِ گردشِ لیل و نہار کی سوگند
مرے دماغ پہ بھی ڈال پرتوِ محبوب   تجھے شعاعِ سرِ کوہسار کی سوگند
سکھا جمال کو ایفائے عہد کا دستور   جفائے طولِ شبِ انتظار کی سوگند
جلا دے حُسن کے سینے میں آرزو کا چراغ   ضمیرِ سنگ میں سوزِ شرار کی سوگند

دلِ فسردہ کو رنگینیوں سے کر سرشار — گلِ شگفتہ کے نقش و نگار کی سوگند
وفا کے دُکھتے ہوئے پہلوؤں کو دے آرام — کنارِ یار و لبِ جوئبار کی سوگند
سُنا فسانۂ رفتارِ دل فروز نگار — جواں خرامیٔ ابرِ بہار کی سوگند
بتا بکھرتی ہے کس طرح زُلف شانوں پر؟ — نزولِ رحمتِ پروردگار کی سوگند
ٹھہر ٹھہر کے سنا داستانِ عشوہ و ناز — نزاکتِ دلِ اُمّیدوار کی سوگند
سُنا دے جوشؔ کو بھی نغمہائے لعلِ نگار
خروشِ آمدِ فصلِ بہار کی سوگند

آ اور جہاں کو غرقِ لبِ نوش خند کر — آوازۂ فسونِ جوانی بلند کر
بل ابروؤں پہ ڈال کے زلفوں کو کھول دے — کونین کو اسیرِ کمان و کمند کر
سُنتا ہوں میں دردِ عشق ہے ہر درد کی دوا — آ اور میرے دردِ جگر کو دوچند کر
آشفتہ خو طبیعت ہے نازک مزاج دل — کیوں کر کروں علاجِ دلِ دردمند کر
گیتی کو غلغلہ ہے گردوں کو اضطراب — محوِ خرامِ ناز! درِ فتنہ بند کر
اے خواجہ! زندگی میں اسیری ہے ناگزیر — دل کو اسیرِ کاکلِ مشکیں کمند کر

آیا ہے جوشؔ تحفۂ داغِ جگر لیے
مرضی تری پسند نہ کر یا پسند کر!

اُٹھی وہ گھٹا، رنگ سامانیاں کر — گہرپاشیاں کر، زرافشانیاں کر
وہ چہکے عنادل، وہ سنکیں ہوائیں — گلوں کی طرح چاک دامانیاں کر
صُراحی جھکا، اور دھومیں مچادے — گلابی اُٹھا، اور گل افشانیاں کر
مٹا داغِ ہوش، اور مدہوش بن جا — اُٹھا جامِ زر، اور سلطانیاں کر
نگاہوں سے برسادے ابرِ جوانی — مئے لالہ گوں سے گلستانیاں کر
سمندر پہ چل، اور الیاس بن جا — ہواؤں پہ اُڑ، اور سلیمانیاں کر
صبا کی طرح کنج میں رقص فرما — بگولوں کے مانند جولانیاں کر
سکوں پاؤں چومے وہ ہلچل مچادے — خرد سر جھکا دے وہ نادانیاں کر

عَلم کھول کر جوشؔ بدمستیوں کے
جہاں داریاں کر، جہاں بانیاں کر

شیخ اور خلشِ بندگی و زحمتِ پرہیز   میں اور مئے دیرینہ و معشوقِ نوخیز
اللہ رے اُس دشمنِ راحت کا تلوّن !   گلبانگ سِماں ہے تو کبھی شورشِ چنگیز
کہسار میں تیشے کی صدا گونج رہی ہے   افسوس ہے اے زمزمۂ عشرتِ پرویز
اللہ ری اُس فتنۂ دوراں کی جوانی   خُوں ریز و شرر ریز و جنوں خیز و دل آویز
اے گیسوئے شبرنگ ! وہی نکہتِ فردوس   اے نرگسِ مخمور ! وہی ساغرِ لبریز

رقصاں رُخِ محبوب میں ہے صبح کی خُنکی
بیدار بھی ہو خواب سے اے جوششِ سحرخیز !

میں قرباں اے مرے تُرکِ قباپوش   کبھی آ اس طرف بھی زلف بردوش
نگارِ خوش خرام و یارِ شیریں   بُتِ آشوبِ عقل و فتنۂ ہوش
ہنوز اے شہریارِ کشورِ دل !   گدائے راہ کا خالی ہے آغوش
کبھی دن تو بن اے جانِ خرابات !   انیسِ خلوتِ رندانِ مے نوش
کروں کس طرح دامن پارہ پارہ   کدھر ہے اے مری سلمائے گل پوش
کبھی تو سامنے آ جام برکف   بہ زعمِ زاہدانِ خرقہ بردوش
وہ گوُنجا نغمۂ شیرینِ جاناں   زمین و آسماں ! خاموش، خاموش !

وہ دستک دی ترے در پر کسی نے
بجا لا سجدۂ شکرانہ اے جوش

مبارک دیدۂ حیراں! مبارک — بہشتِ جلوۂ جاناں مبارک
شبِ تاریک کی خاموشیوں کو — خروشِ مرغِ خوش الحاں مبارک
وفورِ غم کو عشرت کی بشارت — ہجومِ درد کو درماں مبارک
خمِ محرابِ چشمِ آرزو کو — چراغِ چہرۂ خنداں مبارک
نگاہِ رہروِ راہِ طلب کو — سوادِ کوچۂ جاناں مبارک
ہوائے شامِ غم کی گرمیوں کو — نسیمِ صبحِ گل افشاں مبارک
لبِ امید کو موجِ تبسم — بہ یمنِ دیدۂ گریاں مبارک
گدائے رہ نشینِ بے نوا کو — غرورِ صحبتِ سلطاں مبارک
ہوائے بخیۂ زخمِ جگر کو — ادائے جنبشِ مژگاں مبارک

جنابِ جوش کو یہ کامرانی
بہ فیضِ قربِ درویشاں مبارک

پھر مہرباں وہ خسروِ خوباں ہے آج کل — پھر دستِ شوق و دامنِ جاناں ہے آج کل

پھر اعتقادِ عالمِ بالا ہے اِن دنوں — پھر اعتبارِ گردشِ دوراں ہے آج کل

پھر زلفِ ناز و رُوئے درخشاں ہے دام میں — پھر جنسِ ابر و صاعقہ ارزاں ہے آج کل

ہر ذرّہ حقیر ہے فردوسِ رنگ و بُو — ہر دشتِ بے گیاہ گلستاں ہے آج کل

موجِ شمیمِ کاکلِ جاناں کے فیض سے — پھر بازوؤں پہ دولتِ پستاں ہے آج کل

شکرِ خدا کہ پرسشِ شمشیرِ روزگار — پھر مرہمِ جراحتِ پنہاں ہے آج کل

ہر فکر پھر ہے فکرِ الٰہی سے ہم عناں — ہر عزم پھر ارادۂ یزداں ہے آج کل

کیا چیز مل گئی ہے کہ میری نگاہ میں — ہر تاجدار بے سر و ساماں ہے آج کل

پھر جوشؔ بزمِ عیش میں ہر مرحبا نفس
عمرِ مسیح و خضر پہ خنداں ہے آج کل

پھر ابرِ تیرہ اُٹھا، پھر چلی نسیمِ شمال — کدھر ہے ساقیِ جادو نگاہ و زہرہ جمال

برس رہی ہے خنک ابر سے جواں بختی — کھلا ہوا ہے گلستاں میں پرچمِ اقبال

مچل رہی ہے بلندی پہ موجِ آبِ بقا — دمک رہی ہے گلابی میں آتشِ سیّال

فلک کے بام پہ ہے رقصِ نغمۂ عشرت — زمیں کے دوش پہ ہے مژدۂ زوالِ ملال

فضا ہے پرتوِ ابرِ سیہ سے زنگار رنگ — صبا ہے دولتِ بوئے چمن سے مالا مال
کہو کہ آئے سوئے صحنِ باغ تیغ بکف — وہ جس کے واسطے ہے خونِ کائنات حلال
وہ جوش سوئے چمن جھومتا ہوا آیا
اٹھو اے زمان و مکاں اٹھو برائے استقبال

زلفِ شکیب و صبر پریشاں ہے آجکل — پھر اضطرابِ سلسلہ جنباں ہے آج کل
پھر عاشقی کے رُو بہ ترقی ہیں ولولے — پھر سعیِ عقل سر بگریباں ہے آجکل
مضرابِ اضطراب ہیں پھر مطربِ جنوں — الجھی دھنوں کے ساتھ غزل خواں ہے آجکل
پھر بوئے گل ہے دشنۂ سرتیز ان دنوں — پھر بادِ صبح شعلۂ عریاں ہے آجکل
پھر آرزوئے شرکتِ بزمِ جمال ہے — پھر اہتمامِ خدمتِ درباں ہے آجکل
پھر قوتِ دلیل ہے ڈالے ہوئے سپر — منسوخ پھر شریعتِ برہاں ہے آجکل
وہ سجدہ جس کے واسطے فرشِ حرم ہے تنگ — پھر آستانِ یار پہ غلطاں ہے آجکل
اللہ رے گدازِ محبت کے معجزے — کافر بنا ہوا جو دماغِ مسلماں ہے آجکل
پھر عزمِ صبر بحرِ ندامت میں غرق ہے — پھر وضعِ احتیاط پشیماں ہے آجکل
پھر اس دل و دماغ کا جوہرِ لطیف — وابستۂ تصورِ جاناں ہے آجکل

اے ہم نشیں! دماغ کی ژولیدگی نہ پوچھ ‎ گویا زمیں، ہواؤں پہ غلطاں ہے آجکل

وہ جاں، جس پہ مایۂ کون و مکاں نثار ‎ پھر نذرِ یک تبسمِ جاناں ہے آجکل

وہ خونِ دل، کہ جنسِ دو عالم سے ہے گراں ‎ بازارِ اضطراب میں ارزاں ہے آجکل

جمتا نہیں تصورِ جاناں پہ بھی خیال ‎ بے چینیوں کا دل میں وہ طوفاں ہے آجکل

نیر نگاہِ نرگسِ جاناں کے فیض سے

پھر جوشش، شرحِ صدر کا ساماں ہے آجکل

پھر آشنائے لذتِ دردِ جگر ہیں ہم ‎ پھر محرمِ کشاکشِ ہر خیر و شر ہیں ہم

ہر سانس دے رہی ہے خبر کائنات کی ‎ پھر بادۂ جمال سے یوں بے خبر ہیں ہم

پھر عشق کی نظر میں ہے معشوقیت کا ناز ‎ پھر حسنِ دل نواز سے شیر و شکر ہیں ہم

جینے کے اشتیاق سے ہے پھر رمیدگی ‎ پھر سینۂ حیات میں عزمِ سفر ہیں ہم

ہشیار باش! ظلمتِ غم خانۂ حیات ‎ پھر مرکزِ تجلیِ شمس و قمر ہیں ہم

کس زعم میں ہے اے شبِ دیجورِ زندگی؟ ‎ پھر رازدارِ نورِ طلوعِ سحر ہیں ہم

ہے کس خیالِ خام میں اے خارزارِ دہر؟ ‎ پھر کامرانِ خندۂ گلہائے تر ہیں ہم

پھر زندگی ہے غم کی امانت لیے ہوئے ‎ ہر دولتِ نشاط سے پھر بہرہ ور ہیں ہم

پھر فیضِ عاشقی سے بہ ایں بے بضاعتی — جیبِ جہاں میں دولتِ لعل و گہر ہیں ہم
پھر باوجودِ فقر وہ حاصل ہے طمطراق — تو یہ کہے کہ صاحبِ تاج و کمر ہیں ہم
آنکھوں میں نورِ مصحفِ جاناں لئے ہوئے — پھر کردگارِ عشق کے پیغامبر ہیں ہم

کھلتے نہیں ہیں جوشؔ دماغوں پہ دل کے راز
بالاتر از رسائیٔ نقد و نظر ہیں ہم

پھر سر کسی کے در پہ جھکائے ہوئے ہیں ہم — پردے پھر آسماں کے اٹھائے ہوئے ہیں ہم
چھائی ہوئی ہے عشق کی پھر دل پہ بےخودی — پھر زندگی کو ہوش میں لائے ہوئے ہیں ہم
جس کا ہر ایک جزو ہے اکسیرِ زندگی — پھر خاک میں وہ جنس ملائے ہوئے ہیں ہم
ہاں کون پوچھتا ہے خوشی کا نہفتہ راز؟ — پھر غم کا بار دل پہ اٹھائے ہوئے ہیں ہم
ہاں کون درسِ عشق و جنوں کا ہے خواستگار — آئے، کہ ہر سبق کو بھلائے ہوئے ہیں ہم
آئے جسے ہو جادۂ رفعت کی آرزو — پھر سر کسی کے در پہ جھکائے ہوئے ہیں ہم
بیعت کو آئے جس کو ہو تحقیق کا خیال — کون و مکاں کے راز کو پائے ہوئے ہیں ہم
ہستی کے دامِ سخت سے اکتا گیا ہے کون؟ — کہہ دو کہ پھر گرفت میں آئے ہوئے ہیں ہم
ہاں کس کے پائے دل میں ہے زنجیرِ آب و گل؟ — کہہ دو کہ دامِ زلف میں آئے ہوئے ہیں ہم

ہاں کس کو جستجو ہے نسیمِ فراغ کی؟ آسودگی کو آگ لگائے ہوئے ہیں ہم
ہاں کس کو سیرِ ارض و سما کا ہے اشتیاق؟ دھونی پھر اُس گلی میں رمائے ہوئے ہیں ہم

جس پر نثار کون و مکاں کی حقیقتیں
پھر جوشؔ اُس فریب میں آئے ہوئے ہیں ہم

بالا ہیں جوشؔ، دامِ زماں و مکاں سے ہم رسمِ تعینات کو لائیں کہاں سے ہم
کوثر کی آرزو میں رہیں گے نہ تشنہ کام پیماں یہ کر چکے ہیں مئے ارغواں سے ہم
اے حسنِ لازوال! قسم تیرے ناز کی بیگانہ ہو چکے ہیں بہار و خزاں سے ہم
انمول بننے والے ہیں جس چیز سے کبھی ارزاں ہیں آجکل اُسی جنسِ گراں سے ہم
اب اے خدا! عنایتِ بیجا سے فائدہ؟ مانوس ہو چکے ہیں غمِ جاوداں سے ہم
روز اِک نئی زمیں سے گزرتے ہیں ہر نفس ملتے ہوئے ہیں موجۂ آبِ رواں سے ہم
کیا کہہ رہے ہو دُور سے اربابِ کیف و کم؟ باہر کھڑے ہیں حلقۂ سود و زیاں سے ہم
یہ طرفہ بات ہے کہ بایں فقر و بے زری ہیں بہرہ یابِ دولتِ کون و مکاں سے ہم
جب حسن چاہے عشق کے سانچے میں ڈھال لے پگھلے ہوئے ہیں آتشِ رطلِ گراں سے ہم
پائندہ باش اے خمِ ابروئے دل نشیں! اب کھیلتے ہیں موت کے تیر و کماں سے ہم

اہلِ زمیں! غریب ہیں ہم، نکتہ چیں نہ ہو — آتے ہیں گاہ گاہ یہاں آسماں سے ہم

ہر نقشِ پا میں لوٹ رہی ہیں جوانیاں — یوں آ رہے ہیں خدمتِ پیرِ مغاں سے ہم

جنگل ہے، آبِ جو ہے، شبِ ماہتاب ہے — ایسے میں اُن کو ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم

ہاں آسماں! اپنی بلندی سے ہوشیار — لے سر اُٹھا رہے ہیں کسی آستاں سے ہم

اُٹھنا تھا جن کو چین و عجم سے، سو اُٹھ چکے
اب جوشؔ اُٹھے ہیں کشورِ ہندوستاں سے ہم

نہ جادو، نہ افسوں گری چاہتا ہوں — فقط حُسن سے دلبری چاہتا ہوں

حضوری کے پُر رعب دربار میں بھی — دلِ تُند و شوقِ جری چاہتا ہوں

مری جنس کے ہات بک جائے خود ہی — میں وہ قدرداں مشتری چاہتا ہوں

اہانت گوارا نہیں عاشقی کی — غلامی میں بھی سروری چاہتا ہوں

مزاجِ تمنائے خوددار توبہ — عبادت میں بھی داوری چاہتا ہوں

مُصر ہے اگر دلبری "داوری" پہ — کم از کم میں پیغمبری چاہتا ہوں

جو پیغمبری میں بھی دشواریاں ہوں — تو ہنگامۂ کافری چاہتا ہوں

خلاصہ ہے یہ جوشؔ اِس داستاں کا — کہ جوہر ہوں اور جوہری چاہتا ہوں

دوستو! وقت ہے پھر زخمِ جگر تازہ کریں　　پردہ جنبش میں ہے پھر آؤ نظر تازہ کریں
تا کجا نالۂ غربت، کہ چلی بادِ شمال　　دل میں پھر زمزمۂ عزمِ سفر تازہ کریں
آؤ، پھر دھوم سے ہو آج غروب اور طلوع　　سُنّتِ بندگیٔ شمس و قمر تازہ کریں
آؤ چل کر رُخِ ناشستہ کو دیکھیں دمِ صبح　　موجِ رنگِ اُفق و نورِ سحر تازہ کریں
کُلَہِ فقر کو کج کر کے سرِ بزمِ نشاط　　آؤ رسمِ کہنِ تاج و کمر تازہ کریں
آؤ پھر جلوۂ جاناں پہ لٹا دیں کونین　　شغلِ پارینۂ اربابِ نظر تازہ کریں
طبقِ زر میں لگا کر پئے نذرِ جاناں　　آؤ پھر آبروئے لعل و گہر تازہ کریں

آؤ پھر جوشؔ کو دے کر لقبِ شاہِ سخن
دل و دینِ سخن و جانِ ہنر تازہ کریں

مری مجال تیری بزم اور لن ترانیاں!
میں نقشِ پائے رہرواں، تو افسرِ جہانیاں
سخن فروشیاں نہ کر جہانِ حسن و عشق میں
کہ یاں ہر ایک خال میں ہیں لاکھ نکتہ دانیاں
وہ زیبِ انجمن ہوا تو کوئی بولتا نہیں

معاشرانِ بزم کیا ہوئیں وہ گل فشانیاں؟

ذرا اثر نہ پڑ سکا جنونِ ذوقِ دید پر
پیمبروں نے لاکھ کیں نظر کی پاسبانیاں

شدید بد گمانیوں پہ حسنِ ظن ہے یار سے
عمیق حسنِ ظن میں ہیں ہزار بدگمانیاں

عجیب طرفہ راز ہیں، مری شبوں کے راز بھی
جنھیں نہاں کیے ہوئے ہیں سیکڑوں جوانیاں

شبابِ رفتہ کے قدم کی چاپ سن رہا ہوں میں
ندیم! عہدِ شوق کی سنائے جا کہانیاں،

مری بساطِ مے کشی پر جوشِ سجدہ ریز ہیں
کروڑ قہرمانیاں، ہزار ہا کیانیاں

اُٹھ کہ تعمیرِ حیاتِ گزراں کچھ بھی نہیں
جز مئے ناب سر و برگِ جہاں کچھ بھی نہیں

آ، کہ یہ وسوسۂ ارض و سما ہے بیکار
اُٹھ، کہ یہ واہمۂ سود و زیاں کچھ بھی نہیں

وہ سہی قد، لبِ ساحل جو نہ ہو گرمِ خرام
قامتِ سرو و خمِ آبِ رواں کچھ بھی نہیں

جام اُٹھا جام، کہ سرشاری و مستی کے بغیر
خندۂ حور و تماشائے جناں کچھ بھی نہیں

پرتوِ چشمِ فسوں خیزِ برہمن کے سوا
نقشِ رنگینیٔ رخسارِ بتاں کچھ بھی نہیں

فیض اُٹھا حُسنِ جوانانِ چمن سے کہ ندیم
عالمِ پیرِ سحر جز وہم و گماں کچھ بھی نہیں

اُس کے نزدیک سمجھتا ہو جو اسرارِ بہار
خوفِ گلچیں و غمِ بادِ خزاں کچھ بھی نہیں

جُز غمِ عشق، غمِ کون و مکاں بے بنیاد
جُز دلِ شاد، متاعِ دو جہاں کچھ بھی نہیں

ایک ذرّہ بھی ہو محسوس تو سب کچھ ہے وہی
ہو نہ محسوس تو خلّاقِ جہاں کچھ بھی نہیں

مرضِ زیست کا اے جوش زمانے میں علاج
جُز مئے کہنہ و معشوقِ جواں کچھ بھی نہیں

وقتِ سحر ہے آؤ خمِ لعلفو ا وضو کریں
مینا اُٹھائیں، خدمتِ جام و سبو کریں

لو کھُل گیا وہ پرچمِ خورشیدِ زرنگار
اُٹھّو کہ وا دریچۂ صد رنگ و بُو کریں

طائر خروش میں ہیں، صبا گرمِ اختلاط
آؤ حریمِ کیف میں پھر ہاؤ ہُو کریں

مستانہ وار جیبِ جوانی کے چاک ہیں
پھر رشتۂ شرابِ کہن سے رفو کریں

پھر رُوئے خوش نگار کی دہرائیں داستاں
حُسن و جمالِ یار کی پھر گفتگو کریں

ملبوسِ زندگانی و رختِ حیات کو
صہبا کی نرم آنچ سے پھر شست و شو کریں

آؤ بنائیں یار کو پھر صدرِ انجمن　　آئینہ آفتاب کے پھر روبرو کریں
دنیا کو، آؤ، رشکِ بہشتِ بریں بنائیں　　خشکی کو آؤ، روکشِ صد آبجو کریں
لیلائے کیفِ دوش کا مرجھا چلا ہے ہار　　پھر تازہ پھول گوندھ کے زیبِ گلو کریں
آنے لگی ہے دیر سے ناقوس کی صدا　　آؤ تصورِ صنمِ سادہ رُو کریں
بہرِ دعا زمانہ اُٹھائے ہوئے ہے ہات　　یارو اُٹھو کہ بیعتِ دستِ سبُو کریں

پھر آؤ، دل کا جوش کے نغموں سے رس لیں
پھر آؤ تازہ رسم و رہِ آرزو کریں

آپ بھی آئیں کہ ہے دیر سے گرمِ تگ و دَو　　لرزشِ بادۂ دیرینہ و عکسِ مہِ نو
وقتِ دیدار مچل جاتے ہیں ارماں جیسے　　یوں ہے ہلچل میں لبِ آبِ رواں شمع کی لَو
کروٹیں روح میں جس طور سے لے یادِ حبیب　　جام میں چاند کا یوں کانپ رہا ہے پرتو
سینۂ شب میں تصوّر ہے سحر کا غلغلہ　　یا ہے جنگل کی گھنی چھاؤں میں مہتاب کی ضَو
دل ہی دل میں کوئی معشوق سے ہے گرمِ سخن　　سازِ بر دوش ہے یا بادِ خوش آہنگ کی رَو
پتّا پتّا ہے مثالِ لبِ لعلِ سلمیٰ　　ریشہ ریشہ ہے جوابِ کمرِ کیخسرو
دفن ہے سانس میں افسردگیٔ ماضی و حال　　غرق ہے رطلِ گراں میں غمِ دیرینہ و نَو

دفن ہے ساز میں افسردگیٔ ماضی و حال   غرق ہے رطلِ گراں میں غمِ دیرینہ و نو

تم بھی اس بزم میں ہو چند نفس عشوہ فروش

کہ پڑے چرخ پہ بھی صحنِ زمیں سے پرتو

آ کے پھر آج ہم آہنگ ہوئی ہے لبِ جو   نے کی لَے، چاند کی تنویر، صبا کی خوشبو

منعقد پھر سے کرو محفلِ جمشید و قباد   دو گھڑی صدر نشینی پہ جو آمادہ ہو تو

وقتِ کُن جو دلِ یزداں میں ہوا تھا غلطاں   میرے دل میں بھی وہی آ کے جگا دے جادو

کفر سجدے میں گرے، دین کی نبضیں چھٹ جائیں   آج آ، دوش پہ بکھرائے ہوئے یوں گیسو

میں ہوں وہ رند جسے دیکھ کے کہتے ہیں ملک   آفریں بادبر ایں خلوتیٔ جام و سبو

عقل کہتی ہے کہ کس طرح میسر ہوگا   عشق کہتا ہے کہ فردوس ہے تیرا پہلو

کیفِ مستی ہیں گھٹا بارِ گراں آنکھوں کو
غمِ ہستی سے ٹپکتے نہیں جن کے آنسو

آ پلا پھر مئے اسرارِ سکون و جنبش
اے بہ نمکیں حرمِ قدس و بہ شوخی آہو

آج یوں دل میں لطافت سے ہیں ارماں بیچین
جیسے طاعت میں بدلتے ہیں فرشتے پہلو

خاک مست، آبِ رواں تند، ہوائیں سرشار
آج اپنے پہ عناصر کو نہیں ہے قابو

آج اے نورِ نگاہِ قمر و بنتِ سحاب!
کاش میرا سرِ شوریدہ ہو، تیرا زانو

پرسشِ چند نفس اے مرے سرمایۂ شوق!
زحمتِ چند قدم، اے مرے سروِ دلجو!

آج اے جوشؔ ترے رنگِ غزل گوئی سے
قندِ پارس کا مزا ہے بزبانِ اردو

نہ جانے رات کو تھا کون زینتِ پہلو
مچل رہی تھی ہوا میں شراب کی خوشبو

حریمِ مصلحت میں قدم تھا ایک مرکز پہ
مزاجِ عشق و تقاضائے حسنِ عربدہ جو

وفا کی انجمنِ شوق میں تھی شیر و شکر
جراحتِ دلِ صد چاک و تیغِ صاعقہ خو

مٹا چکا تھا فلک رسمِ ساغر و سنداں
بھلا چکا تھا زمانہ نزاعِ سنگ و سبو

ہوا کی جیب میں تھا تیر از کماں رفتہ
کشش کے دام میں تھی کاوشِ رمِ آہو

بساطِ خاک پہ خوابیدہ تھا غمِ دوراں
شرابِ تند کی لہروں میں غرق تھے آنسو

اُدھر محیطِ فلک پر فسونِ انجم و قمر — اِدھر حریمِ تمنّا میں نرگسِ جادو

اُدھر حیات کی لحنِ طرب بھی تا بہ فلک — اِدھر شباب کی موجِ رواں بھی تا بہ گلو

اُدھر اُڑا ہوا طولِ شبِ فراق کا رنگ — اِدھر شباب پہ آرائشِ خمِ گیسو

چھڑی ہوئی ہے حکایتِ شبِ جوانی میں

تڑپ کے جوشؔ! پھر اِک بار نعرہ یاہو

فکر ہی ٹھہری تو دل کو فکرِ خوباں کیوں نہ ہو؟ — خاک ہونا ہے تو خاکِ کوئے جاناں کیوں نہ ہو؟

دہر میں اے خواجہ! ٹھہری جب اسیری ناگزیر — دل اسیرِ حلقۂ گیسوئے پیچاں کیوں نہ ہو؟

زیست ہے جب مستقل آوارہ گردی ہی کا نام — عقل والو! پھر طوافِ کوئے جاناں کیوں نہ ہو؟

جب نہیں مستوریوں میں بھی گناہوں سے نجات — دِل کھلے بندوں غریقِ بحرِ عصیاں کیوں نہ ہو؟

اِک نہ اِک ہنگامے پر موقوف ہے جب زندگی — میکدے میں رندِ رقصاں و غزلخواں کیوں نہ ہو؟

جب خوش و ناخوش کسی کے ہاتھ میں دینا ہے ہاتھ — ہمنشیں! پھر بیعتِ جامِ زر افشاں کیوں نہ ہو؟

جب بشر کی دسترس سے دور ہے "حبل المتیں" — دشتِ وحشت میں پھر اک کافر کا داماں کیوں نہ ہو؟

ایک ہے جب شورِ جہل و بانگِ حکمت کا مآل — دل ہلاکِ ذوقِ گلبانگِ پریشاں کیوں نہ ہو؟

اِک نہ اِک رفعت کے آگے سجدہ لازم ہے تو پھر — آدمی محوِ سجودِ سرِّ خوباں کیوں نہ ہو؟

اک نہ اک پھندے ہی میں پھنسنا ہے جب انساں کو — دوش پر دامِ سیاہ سنبلستاں کیوں نہ ہو؟

جب فریبوں ہی میں رہنا ہے تو اے اہلِ خرد — لذتِ پیمانِ یارِ سست پیماں کیوں نہ ہو؟

ہاں جب آویزش ہی ٹھہری ہے تو ذرے چھوڑ کر — آدمی خورشید سے دست و گریباں کیوں نہ ہو؟

اک نہ اک ظلمت سے جب وابستہ رہنا ہے تو جوش
زندگی پر سایۂ زلفِ پریشاں کیوں نہ ہو؟

اس طرف آ، ستمِ گردشِ ایام بھی دیکھ — کامرانِ لب و رخسار کو ناکام بھی دیکھ

جو تری مست نگاہوں سے تھا کل تک سرشار — آج اسی جام کو بے بادۂ گلفام بھی دیکھ

نیند آتی ہی نہ تھی جس کی تا صبح میں تجھے — اب اسی دل کو اسیرِ غم و آلام بھی دیکھ

کل تری چشمِ کرم سے جو ہوئی تھی طالع — آج اس صبحِ درخشاں کی ذرا شام بھی دیکھ

کامراں جس کو بنایا تھا وفائے تیری — اب اسی شوق کو افسردہ و ناکام بھی دیکھ

رامش و رنگ سے معمور تھے گوشے جس کے — آج اسی انجمنِ شوق میں کہرام بھی دیکھ

جو مرے دل میں چمکتا تھا نظر سے تیری — اب اسی نور کو خورشیدِ لبِ بام بھی دیکھ

تو نے جس عشق کی رکھی تھی مرے دل میں بنا — آ، اب اس عشقِ خوش آغاز کا انجام بھی دیکھ

مرکزِ وحیِ محبت تھا کبھی دل جس کا
اب اسی جوش کو لب تشنۂ پیغام بھی دیکھ

اُٹھ، کہ آئی ہے صبا دولتِ بیدار کے ساتھ
نغمۂ کاکُل و بُوئے نفسِ یار کے ساتھ

اُٹھ، کہ خورشید نے گردوں پہ عَلَم کھول دیا
چھیڑ کرنے کو کسی طُرّۂ طرار کے ساتھ

اُٹھ، کہ کُہسار کی چوٹی سے چلیں وہ کرنیں
ناز کرتی ہوئی گلہائے طرحدار کے ساتھ

اُٹھ، کہ لچکی ہوئی ہر شاخ ہے سرگرمِ نیاز
مطرب نغمہ زن و ساقیٔ سرشار کے ساتھ

اُٹھ، کہ غنچوں نے چٹکنے کا کیا ہے آہنگ
باندھ کر عہدِ وفا نرگسِ بیمار کے ساتھ

اُٹھ، کہ گلزار میں دوشیزۂ رنگینِ فلک
محوِ گُل گشت ہے پازیب کی جھنکار کے ساتھ

اُٹھ، کہ غرفوں سے خرابات کے تنویرِ سحر
کھیلنے آئی ہے رندانِ قدح خوار کے ساتھ

دیکھ، تاریک اُفق پر ہے سحر کی سُرخی — جوش! اُٹھ تذکرۂ کاکل و رخسار کے ساتھ

ہاں اِس طرف بھی عابدِ شب زندہ دار دیکھ
ایمان ڈھل نہ جائیگا، صرف ایک بار دیکھ

تاکے یہ جستجو و خیز بہ آہنگِ خانقاہ؟
آ بوستاں میں رقصِ نسیمِ بہار دیکھ

مستوریوں میں لطف و عطا کا گزر نہیں؟
مستوں میں جوشِ رحمتِ پروردگار دیکھ

تا چند اشتیاقِ نمودِ ہلالِ عید؟
ابرو پہ نازِ طرّۂ زلفِ نگار دیکھ

اے قدر دانِ سکّۂ مقلوبِ سلسبیل!
رطلِ شراب کا زرِ کامل عیار دیکھ

ظرفِ گلی میں آبِ وضو دیکھتا ہے کیا؟
آ جامِ زر میں آتشِ دانا شکار دیکھ

اِک واہمہ ہے طنطنۂ شیخ مدرسہ
آ میکدے میں ولولۂ بادہ خوار دیکھ

دُودِ چراغِ مسجد و محراب تا کجا؟
آ پیچ و تابِ ابرِ سرِ کوہسار دیکھ

تا کے تصوّرِ لبِ نہر و خرامِ حور؟
نازِ سہی قدانِ لبِ جوئبار دیکھ

تا کے ہوائے کاکلِ پیرانِ پارسا؟
ادنا مرادِ اعصریدہ زلفِ یار دیکھ

کیا دیکھتا ہے زُہد کے کُوچے میں رُعبِ شیخ
کوئے مغاں میں جوشؔ کا عزّ و وقار دیکھ

پا چکا طاعت کی لذت، درد کے پہلو بھی دیکھ
شیخ! آ محراب سے باہر، خمِ ابرو بھی دیکھ

کافرِ نعمت! ادا کر کچھ تو حقِ چشم و گوش
نغمۂ مطرب بھی سن، حسنِ رخِ نیکو بھی دیکھ

تا کجا طنبورۂ یزداں فریبِ خانقاہ؟
آ کسی دن میکدے کا رقصِ ہاؤ ہو بھی دیکھ

سر جھکانے ہی کو سمجھا ہے مآلِ زندگی؟
جن سے دل جھکتا ہے حق جوئی کے وہ پہلو بھی دیکھ

چونک اے دیوانۂ گلگشتِ حورانِ بہشت
دو گھڑی میدان میں آکر رمِ آہو بھی دیکھ

ضربتِ تیغِ مجاہد کے ثنا خوانِ قدیم!
بے ستوں پر کوہکن کی قوتِ بازو بھی دیکھ

فرشِ مسجد سے اٹھا بھی خاک آلودہ جبیں
رکھ کے زیرِ سر کسی معشوق کا زانو بھی دیکھ

عشقِ مولیٰ کے لئے ہے عشقِ انساں ناگزیر
ساز بے رنگی کے طالب! سوزِ رنگ و بو بھی دیکھ

گیسوئے طاعت میں پیدا کر خمِ سوز و گداز
دانۂ تسبیح پر بہتے ہوئے آنسو بھی دیکھ

اے ہلالِ عید کی رویت کے مشتاقِ کہن!
خنجرِ بُرّاں کو شرماتے ہوئے ابرو بھی دیکھ

مو شگافی تا کجا "واللیل" کی تفسیر میں؟
مہ وشوں کے دوش پر بکھرے ہوئے گیسو بھی دیکھ

سحر اوراد و وظائف، ہاں مسلّم ہے مگر
نرگسِ مستانہ کا چلتا ہوا جادو بھی دیکھ

حسن ذرّوں سے ابلتا ہے کبھی تو جام اٹھا
دیکھتی ہیں جوش کی آنکھیں جو عالم تو بھی دیکھ

وہ شیشۂ شفق سے چھلکی مئے مغانہ | اے ساقیِ شبینہ! وا کر شراب خانہ
ہاں اے فلک! لٹا دے اپنی تمام دولت | ہاں اے زمیں! اگل دے اپنا ہر اک خزانہ
رنگِ شفق کی ہلکی گلرنگ روشنی ہیں | ہر غنچہ اک فسوں ہے، ہر پھول اک فسانہ
ہر شے سے پھوٹ نکلیں چشمے جوانیوں کے | ہاں اے نگارِ نورس! الیسا کوئی ترانہ
حوروں نے لو وہ کھولے فردوس کے دریچے | خالی نہ جائے کوئی اے معجزِ انشانہ
مکتب ہیں بے حقیقت، جھوٹی ہیں درسگاہیں | اے عندلیب! وا کر گل کا کتاب خانہ
فرقت کے ولولے بھی، ذوقِ رمیدگی بھی | قرباں ترے دو عالم، اے چشمِ آہوانہ
دامن چھڑا نہ دامن، دامن چھڑا نہ دامن | اے آفتِ زمانہ! اے آفتِ زمانہ
ہاں اے نگاہِ رعنا! ایک لحنِ سحر پرور | ہاں اے بلند بالا! ایک رقصِ جاودانہ
اے پھول! راس آئیں نقش و نگارِ قدرت | اے شاخِ گل! مبارک شانِ پیمبرانہ
اٹھ باغباں! خدارا گلشن میں نصب کر دے | ہلکی سی چاندنی میں پھولوں کا شامیانہ
نغموں کو تیز کر دے ہاں اے جوان مغنّی! | وہ آ رہا ہے واپس گزرا ہوا زمانہ

ہاں یار! اک اشارہ بر وضعِ دل رُبائی
ہاں جوش! ایک نعرہ با طرزِ عاشقانہ

ٹھنڈی ہوا ہے، رقص میں ہے ابرِ بہمنی
ہاں دیر کیا ہے؟ ساقیِ رنگیں! ہُو الغنی

انساں اور ہو نہ سکے خوش!! اُٹھا تو جام
ناداں! ترے دل کی کلی ہے شگفتنی

ہاں چھیڑ بھی رباب کہ ہے گرمِ اختلاط
حُسنِ سرود و مہفتہ و ابریقِ یک منی

اِس خاکداں میں جز رُخِ محبوب و سازِ کیف
اِک چیز دیدنی ہے، نہ اِک شے شنیدنی

آہستہ ہو کے نازکو دے دعوتِ نیاز
نبضِ صنم میں گرم ہے خونِ برہمنی

اُٹھ، گوشِ دل کو قلقلِ مینا سے تیز کر
تا سُن سکے صبا کے سخنہائے گفتنی

صہبا سے دھو نگاہ کہ غلطاں ہے دیر سے
جاناں کے دل میں آرزوئے بُرقعہ افگنی

چھلکا چمن میں جام کہ بیر رو بھی دیکھ لے
سبزے پہ اوس، اوس پہ مے، مے پہ چاندنی

واللہ آج ہست ہیں تو جوشِ فہد سے
رحمت خُدا کی تجھ پہ ہو اے مردِ یک فنی

دُنیا میں مجھے حور، نہ عقبےٰ میں پری دے
آ، نالۂ شبگیر و دعائے سحری دے

اُٹھ لیلیٰ دل کو رُخِ گُل رنگ عطا کر
آ، دیدۂ تخئیل کو جادو نظری دے

پوشیدہ ہیں اِس خاک میں کتنے دُرِ نایاب
خاکسترِ دل کو شررِ دیدہ وری دے

بیہودگیِ خلعتِ ناموس کہاں تک؟
اے خالقِ وحشت! خلشِ جامہ دری دے

آلودہ ہے پھر زنگ سے انساں کا سینہ — اے نورِ دو عالم! اسے آئینہ گری دے

تمکین کے ناخن سے ترے خم نہیں کھلتے — اے زلفِ سیہ! رخصتِ آشفتہ سری دے

ہاں جوش سے اٹھتے نہیں قدرت کے حجابات

اے یارِ نہفتہ! صفتِ پردہ دری دے

جی میں آتا ہے کہ پھر مژگاں کو برہم کیجیے — کاسۂ دل لے کے پھر دریوزۂ غم کیجیے

گونجتا تھا جس سے کوہِ بے ستون و دشتِ نجد — گوشِ جاں کو پھر انہیں نالوں کا محرم کیجیے

حسنِ بے پروا کو دے کر دعوتِ لطف و کرم — عشق کے زیرِ نگیں پھر ہر دو عالم کیجیے

دورِ پیشیں کی طرح پھر ڈالیے سینے میں زخم — زخم کی لذت سے پھر طیّارِ مرہم کیجیے

صبح سے تا شام رہیے قصۂ عارض میں گم — شام سے تا صبح ذکرِ زلفِ برہم کیجیے

دل کے ہنگاموں کو کیجیے دل کے سناٹے میں غرق — رات کی خاموشیوں کو وقفِ ماتم کیجیے

دائمی آلام کا خوگر بنا کر روح کو — ناگہانی حادثوں کی گردنیں خم کیجیے

غیظ کی دوڑی ہوئی ہے لہر سی اصنام میں

جوش! اب اہلِ حرم سے دوستی کم کیجیے

سرشار ہوں، سرشار ہے دنیا مرے آگے
کونین ہے اک لرزشِ صہبا مرے آگے

ہر نجم ہے اک عارضِ روشن مرے نزدیک
ہر ذرّہ ہے اک دیدۂ بینا مرے آگے

ہر جام ہے نظّارۂ کوثر مرے حق میں
ہر گام ہے گلگشتِ مصلّیٰ مرے آگے

ہر پھول ہے لعلِ شکر افشاں کی حکایت
ہر غنچہ ہے اک حرفِ تمنّا مرے آگے

اک مضحکہ ہے پرسشِ عقبیٰ مرے نزدیک
اک وہم ہے اندیشۂ فردا مرے آگے

ہوں کتنی ہی تاریک شبِ زیست کی راہیں
اک نور سا رہتا ہے جھلکتا مرے آگے

میں اور ڈروں صولتِ دنیائے دنی سے!
خود لرزہ براندام ہے دنیا مرے آگے

جھکتا ہے بصد عجز کلیسا مرے در پہ
آتا ہے لرزتا ہوا کعبا مرے آگے

پیمانے سے جس وقت چھلک جاتی ہے صہبا
لہراتا ہے اک حسن کا دریا مرے آگے

جب چاند جھمکتا ہے مرے ساغرِ زر میں
چلتا نہیں خورشید کا دعویٰ مرے آگے

جب جھوم کے مینا کو اٹھاتا ہوں گھٹا میں
ہلتا ہے سرِ گنبدِ مینا مرے آگے

آتی ہے دلہن بن کے مشیّت کی جلو میں
آوارگیِ آدمؑ و حوّا مرے آگے

پیمانے پہ جس وقت جھکاتا ہوں صراحی
جھکتا ہے سرِ عالمِ بالا مرے آگے

پہلو میں ہے اک زہرہ جبیں، ہاتھ میں ساغر
اس وقت نہ دنیا ہے نہ عقبیٰ مرے آگے

جوش اٹھتی ہے دشمن کی نظر جب مری جانب
کھلتا ہے محبّت کا دریچا مرے آگے

بے حجابانہ در آ، رُوح کو مضطر کر دے
جسم کو جان بنا، خاک کو جوہر کر دے

آ، تمنّاؤں میں بھرتا ہُوا پھر طرفہ خروش
دل کو پھر منصبِ شورش پہ مقرر کر دے

آتشِ یاس کو دیتا ہُوا پیغامِ اُمید
ایک ہلچل سی سرِ بالش و بستر کر دے

آ، خس و خارِ جنوں کو بھی بنا سرو و سمن
آ، شبستانِ وفا کو بھی منور کر دے

عالمِ عشق کو پھر عہدِ گُل ارزانی کر
ذرّۂ شوق کو پھر خسروِ خاور کر دے

ایک ہی دَور میں آج اے نگہِ بادہ فروش
فتنۂ ہوش کو غرقِ مئے احمر کر دے

آتشِ تشنگیٔ دل کو بنا آبِ خضر
گردِ آئینۂ ہستی کو سکندر کر دے

تجھ کو اپنے لبِ گُلرنگ کی خوشبُو کی قسم
شامِ ہجراں کی ہواؤں کو معطّر کر دے

صحنِ گیتی کے، بہ یک نازِ مٹا پست و بلند
سطحِ عالم کو، بہ یک عشوہ برابر کر دے

عشق کے سر کو بنا حُسن کے زانو کا نگیں
خار کو، دولتِ آغوشِ گُلِ تر کر دے

موجۂ چشمۂ حیواں کا تصدّق اے زُلف
میرے شانوں پہ رواں زمزم و کوثر کر دے

آ، سُنا رُوئے کتابی کی کوئی آیۂ ناز
جوشِ وارفتہ کو شاعر سے پیمبر کر دے

آ، فصلِ گُل ہے غرقِ تمنّا ترے لئے
ڈُوبا ہُوا ہے رنگ میں صحرا ترے لئے

ساحل پہ سروِ ناز کو دے زحمتِ خرام
بل کھا رہا ہے خاک پہ دریا ترے لئے

ایفائے عہد کر، کہ ہے مدّت سے بیقرار
رُوحِ وفائے وعدۂ فردا ترے لئے

شانوں پہ اب تو کاکلِ شبرنگ کھول دے
بکھری ہُوئی ہے زُلفِ تمنّا ترے لئے

اُٹھ چشمِ جادوانۂ ساغر فروش! اُٹھ
مچلی ہُوئی ہے لرزشِ صہبا ترے لئے

موجِ شمیمِ سُنبل و ریحاں کے درمیاں
وا ہے مصاحبت کا دریچا ترے لئے

اے آفتابِ جلوۂ جاناں! بلند ہو
کھویا ہُوا ہے مطلعِ دُنیا ترے لئے

آ، اور داد دے، کہ بایں چشمِ حق نگر
کھائے ہوئے ہوں زیست کا دھوکا ترے لئے

سبزے کا فرش، ابر کا خیمہ، گُلوں کا عطر
گلشن میں اہتمام ہے کیا کیا ترے لئے

طغیانِ گُل شباب پہ، بُلبُل خروش میں
اک حشر سا ہے باغ میں برپا ترے لئے

جوشؔ اور رنگِ خدمتِ سُلطان و پاسِ ہوش!
یہ بھی رکئے ہوئے ہے گوارا ترے لئے

ہنوز شعلہ ہے پردے میں منہ چھپائے ہوئے — مگر کنول ہیں کہ روشن ہیں بے جلائے ہوئے

ہنوز قطرۂ نیساں ہے اور ضمیرِ سحاب — مگر صدف ہیں ہیں موتی سے جگمگائے ہوئے

ہنوز سنگ کے سینے میں ہے رُخِ اصنام — ابھی سے کتنے برہمن ہیں سر جھکائے ہوئے

ہنوز میان سے باہر نہیں ہوئی ہے وہ تیغ — پڑے ہیں کتنے مگر خون میں نہائے ہوئے

ہنوز غیبتِ خورشید سے اُفق ہے اُداس — تمام دشت کے ذرّے ہیں جگمگائے ہوئے

ہنوز چرخ پہ چھائی نہیں ہے مست گھٹا — چمن کی خاک ہے خود کو دُلھن بنائے ہوئے

چہک رہے ہیں عنادل، مہک رہی ہے نسیم — ہنوز غنچہ ہے بندِ قبا لگائے ہوئے

نہیں ملا ہے صبا کو ہنوز اذنِ خرام — مگر چراغ ابھی سے ہیں جھلملائے ہوئے

سُلگ رہے ہیں برابر ہزارہا خرمن — ہنوز ابر میں بجلی ہیں منہ چھپائے ہوئے

ہنوز دُور ہے اعلانِ تاج پوشیِ شاہ — کھڑے ہیں کتنے گدا آسرا لگائے ہوئے

کھُلے ہوئے ہیں صبا میں ہزارہا نافے — ہنوز زُلف میں ہیں وہ گرہ لگائے ہوئے

ہنوز یار ہے خلوت گزین و حجلہ نشیں — تمام بزم کے چہرے ہیں مسکرائے ہوئے

سُنا ہے جوشؔ اُٹھے گی کسی کی آنکھ ادھر
دِلوں کو لوگ کلیجے سے ہیں لگائے ہوئے

نمایاں انتہائے سعیٔ پیہم ہوتی جاتی ہے
طبیعت بے نیازِ ہر دو عالم ہوتی جاتی ہے

اُٹھی جاتی ہے دل سے ہیبتِ آلامِ روحانی
جراحت بہرِ قلبِ زار مرہم ہوتی جاتی ہے

کنارا کر رہا ہے رُوح سے ہیجانِ سترابی
کہ گردن جستجو کے ذوق میں خم ہوتی جاتی ہے

جنوں کا چھا رہا ہے زندگی پر اک دُھندلکا سا
خرد کی روشنی سینے میں مدھم ہوتی جاتی ہے

نسیمِ بے نیازی آ رہی ہے بامِ گردُوں سے
عروسِ مدّعا کی زُلف برہم ہوتی جاتی ہے

نمایاں ہو چلا ہے اک جہاں چشمِ تصوّر پر
نظر شاید حریفِ ساغرِ جم ہوتی جاتی ہے

گرہ یوں کُھل رہی ہے ہر نفس ذوقِ تماشا کی
کہ ہر ادنیٰ سی شے اب ایک عالم ہوتی جاتی ہے

فضا میں کانپتی ہیں دھندلی دھندلی نقرئی شکلیں
ہر اک تخئیلِ پاکیزہ مجسّم ہوتی جاتی ہے

نہ جانے سلیقۂ احساس پر یہ بات ہے کس کا
طبیعت بے نیازِ شادی و غم ہوتی جاتی ہے

سمجھ میں آئیں کیا باریکیاں قانونِ قدرت کی
عبارت کثرتِ معنی سے مُبہم ہوتی جاتی ہے

تجمل تھا جس کی شورش سے تلاطم بحرِ ہستی کا
مرے دل میں وہ ہلچل جوش اب کم ہوتی جاتی ہے

لے لیا دل اک ہوش رُبا نے | کانِ شوخی، | جانِ حیا نے

آفتِ جانے، فتنۂ شہرے | جانِ جہانے، | رُوحِ روانے

موجِ تبسّم کے دامن میں | برق کی رَو، | بجلی کے خزانے

وقتِ خرامِ ناز جلو میں | صبحِ چمن کے، | تازہ ترانے

بکھری اُلجھی زُلفِ سیہ میں | شامِ طرب کے، | لاکھ فسانے

جنبشِ لعلِ عہد شکن میں | کتنے حیلے، | کتنے بہانے

رقصاں نابِ چشمِ سیہ میں | کیف کے دن، | شورش کے زمانے

رُخ پر کافر زلف کی لہریں | جیسے لمحے، | شب کے سہانے

گاہ بہ لبِ صد چشمۂ نوشیں | گاہ بہ گردن، | تیغ روانے

گاہ بہ خلوت سازِ خموشی! | گاہ بہ جلوت، | شعلہ زبانے

گاہ بہ گفتار آیۂ رحمت | گاہ بہ رفتار، | آبِ روانے

گہ بہ تلطّف نرم نسیمے | گہ بہ تحکّم، | سخت کمانے

گاہ بہ شوخی مستِ غزالے | گاہ بہ مستی، | خوابِ گرانے

گاہ بہ نورِ صبح "یقینے" | گاہ بہ ابرِ شام | "گمانے"

گاہ بہ مسندِ "گفتہ حدیثے" | گاہ بہ پہلو | "رازِ نہانے"

شکر کہ بختِ جوشؔ کے عقدے | کھول دیے پھر | زُلفِ رسانے

مجھ سے ساقی نے کہی رات کو کیا بات اے جوشؔ — یعنی اضداد ہیں پروردۂ یک ذات اے جوشؔ

مست و بیگانہ گزر جا کُرۂ خاکی سے — یہ تو ہے رہ گزرِ سیلِ خیالات اے جوشؔ

اور تو اور، خود انسان بہا جاتا ہے — کتنا پُر ہول ہے طوفانِ روایات اے جوشؔ

لوگ کہتے ہیں حجابات نہیں جُز آیات — کس سے کہیے کہ یہ آیات ہیں خود لات اے جوشؔ

اہلِ الفاظ، شریعت پہ مٹے جاتے ہیں — کس کو سمجھاؤں مشیّت کے اشارات اے جوشؔ

دیکھیے صبحِ جنوں ذہن میں کب طالع ہو — عقل، سنتا ہوں کہ ہے اک ابدی رات اے جوشؔ

قوّتِ کُل کے مصالح سے اور اتنے بدظن، — وائے بر دغدغۂ اہلِ مناجات اے جوشؔ

ساغرِ مئے ہی میں ہوتا ہے طلوع اور غروب — آفریں بر دلِ رندانِ خرابات اے جوشؔ

کون مانے گا کہ ہیں عینِ مشیّت واللہ — زندگانی کے یہ بگڑے ہوئے عادات اے جوشؔ

تجھ کو کیا، فقر میں راحت ہے کہ شاہی میں فراغ
تُو تو ہے خلوتیِ پیرِ خرابات اے جوشؔ

اُدھر مذہب اِدھر انساں کی فطرت کا تقاضا ہے
وہ دامانِ مہِ کنعاں ہے، یہ دستِ زلیخا ہے

اِدھر تیری مشیّت ہے، اُدھر حکمت رسولوں کی
الٰہی! آدمی کے باب میں کیا حکم ہوتا ہے

یہ مانا دونوں ہی دھوکے ہیں رندی ہو کہ درویشی
مگر یہ دیکھنا ہے کون سا رنگین دھوکا ہے؟

کھلونا تو نہایت شوخ و رنگیں ہے تمدّن کا
مُعَرّف میں بھی ہوں لیکن کھلونا پھر کھلونا ہے

مرے آگے تو اب کچھ دِن سے ہر آنسو محبّت کا
کنارِ آب رُکنا باد و گُل گشتِ مصلّیٰ ہے

مجھے معلوم ہے جو کچھ تمنّا ہے رسولوں کی!
مگر کیا درحقیقت وہ خدا کی بھی تمنّا ہے؟

مشیّت! کھیلنا زیبا نہیں میری بصیرت سے
اُٹھا لے اِن کھلونوں کو، یہ دُنیا ہے وہ عقبیٰ ہے

بادۂ سرجوش
(۲)
قدیم رنگِ تغزّل
سنہ ۱۹۲۰ء ـــــ سنہ ۱۹۲۶ء

سنہ ۱۹۲۱ء

سوزِ غم دے کے مجھے اُس نے یہ ارشاد کیا — جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ — جن کو تیری نگہِ لطف نے برباد کیا

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا — جب چلی سرد ہوا، مَیں نے تجھے یاد کیا

ایسے میں سو جان سے اِس طرزِ تکلّم کے نثار — پھر تو فرمائیے کیا آپ نے ارشاد کیا

اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد — اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا

اتنا مانوس ہوں فطرت سے، کلی جب چٹکی — جھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا

میری ہر سانس ہے اِس بات کی شاہد اے موت — میں نے ہر لطف کے موقع پہ تجھے یاد کیا

مجھ کو تو ہوش نہیں، تم کو خبر ہو شاید — لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

کچھ نہیں اِس کے سِوا جوشؔ حریفوں کا کلام
وصل نے شاد کیا، ہجر نے ناشاد کیا

وہ غریب دل کو سبق ملے کہ خوشی کے نام سے ڈر گیا
کبھی ہنس کے تم نے بھی بات کی تو ہمارا چہرہ اُتر گیا

جو بہار ملتی تو پوچھتا کہ کہاں وہ کیفِ نظر گیا
وہ صبا کی شوخیاں کیا ہوئیں، وہ چمن کا حُسن کدھر گیا؟

تری راہ کا یہ اصول ہے کہ شکست مانے تو فتح ہو
جو چلا اکڑ کے وہ گر پڑا، جو جھکا لرز کے، اُبھر گیا

مَیں رموزِ دل سے تھا آشنا، مجھے علم شرطِ قبول تھا
نہ مری پلک سے نمی گئی، نہ مری دعا سے اثر گیا

وہ نشکارِ جلوۂ دہر تھے، ہیں ہلاکِ پرتوِ یار تھا
وہ سنور سنور کے بگڑ گئے، ہیں بگڑ بگڑ کے سنور گیا

یہ عجیب حُسن کے رمز تھے، یہ نرالے ناز کے بھید تھے
وہ نقاب اُلٹ کے جو آ گیا، کوئی جی اٹھا، کوئی مر گیا

تمہیں آہیں سُننے کا شوق تھا، مگر اب بتاؤ کہ وہ کیا گئے کیا؟
جو کراہتا تھا تمام شب، وہ مریضِ جوشؔ تو مر گیا

سنہ ۱۹۲۲ء

کعبہ و دیر و حرم یاد آیا — پھر ہمیں کوئے صنم یاد آیا

رخصت اے مطربِ رنگیں رخصت — آج پھر دیدۂ نم یاد آیا

درِ جاناں پہ جبیں سائی کا — پھر ہمیں جاہ و حشم یاد آیا

تھا جو مخصوص پئے نامۂ شوق — پھر وہ قرطاس و قلم یاد آیا

مٹ چلی تھی خلشِ سجدۂ شوق — پھر ترا نقشِ قدم یاد آیا

جس نے پیچیدہ کئے تھے عقدے — پھر اُسی زلف کا خم یاد آیا

ہمنشیں! تُو نے بھلایا تھا جسے — پھر ترے سر کی قسم یاد آیا

بزمِ خوباں میں جو حاصل تھا کبھی
جوش کو پھر وہ بھرم یاد آیا

سنہ ۱۹۲۲ء

جواں ہوں ہرچند پھر بھی چہرہ ہے جوش بے آب و تاب میرا
مری عروسِ سخن کے رُخ پر چھلک رہا ہے شباب میرا
جہاں تھا داؤد سا مغنّی جہاں تھی یوسف سی شمعِ رنگیں
اُسی شبستاں میں پھر تنعم ہوا ہے اب انتخاب میرا

اُدھر مری نغمہ سنجیوں سے تری جبیں پر ہے اک دمک سی
اِدھر ترے رُخ کی تابشوں سے جھلک رہا ہے رباب میرا

تری تجلّی کہاں نہیں ہے تری کچھ اس میں خطا نہیں ہے
مُخِل ہے میرا غبارِ ہستی مری نظر ہے حجاب میرا

جو اشک دل میں کھٹک رہا تھا ٹپک پڑا صبح چشمِ تر سے
سحر کی تنویر پھیلتے ہی ہوا غروب آفتاب میرا

مری فراست میں شیب آکر اضافہ کچھ بھی نہ کر سکے گا
کچھ ایسے پیچیدہ راستوں سے گزر رہا ہے شباب میرا

۱۹۲۲ء

زہرِ دولت کرچکا جب کام اشرم آئی تو کیا
اب ہوس اپنے کیے پر جوش پچتائی تو کیا

راسِ اوّل تو نہ آئے گی زمانے کی ہوا
راس بھی دو دن زمانے کی ہوا آئی تو کیا

موت کی جانب بڑھا ہے بڑھ کے ہر اک راستہ
زندگی نے عافیت کی راہ دکھلائی تو کیا

صبح کی کرنیں جگا ہی دیں گی خوابِ ناز سے
رات نے کلیوں کی دم بھر آنکھ جھپکائی تو کیا

اصل کی جانب جُھکا دیگی زمانے کی ہوا
پنکھڑی بن کر چمن کی خاک اترائی تو کیا

سلسلہ خوابِ پریشاں کا نہ ٹوٹا صبح تک
ہم کو ہجرِ یار میں لے جوش نیند آئی تو کیا

سنہ ۱۹۲۳ء

بے ہوشیوں نے اور خبردار کر دیا　　سوئی جو عقل، رُوح کو بیدار کر دیا

اللہ رے حسنِ دوست کی آئینہ داریاں　　اہلِ نظر کو نقش بدیوار کر دیا

یارب! یہ بھید کیا ہے کہ راحت کی فکر نے　　انساں کو اور غم میں گرفتار کر دیا

دل کچھ پنپ چلا تھا تغافل کی رسم سے　　پھر تیرے التفات نے بیمار کر دیا

کل اُن کے آگے شرحِ تمنّا کی آرزو　　اتنی بڑھی کہ نطق کو بیکار کر دیا

مجھ کو وہ بخشتے تھے دو عالم کی نعمتیں　　میرے غرورِ عشق نے انکار کر دیا

یہ دیکھ کر کہ اُن کو ہے رنگینیوں کا شوق

آنکھوں کو ہم نے دیدۂ خونبار کر دیا

سنہ ۱۹۲۳ء

جو چاہنا اختیار کرنا　　دُنیا پہ نہ اعتبار کرنا

اے حشر! یہ تجھ سے التجا ہے　　اب ہم کو نہ ہشیار کرنا

اے بادِ صبا! اُس آشنا کو　　ہم سے بھی کبھی دوچار کرنا

حاصل ہو خدا کرے تجھے جوشؔ

نظّارۂ رُوئے یار کرنا

یہ عجیب رنگ تھا مے کشو! کہ ہر ایک چہرے پہ نور تھا
یہ گماں ہے مجھ کو گزشتہ شب کوئی مست تم میں ضرور تھا
میں تڑپ کے حسن کو پا گیا، وہ چمک کے خاک میں مل گیا
میں شہیدِ جلوۂ بے خودی، وہ ہلاکِ رنگِ شعور تھا
مرے سامنے تھا وہ جلوہ گر، اُسے پا سکی نہ مری نظر
یہ ضیائے کثرتِ جلوہ تھی، یہ ہجومِ شانِ ظہور تھا
یہ عجیب حسنِ قبول تھا کہ میں خاکِ راہِ وفا بنا
سِتمِ زمانہ سے ایک دن مجھے خاک ہونا ضرور تھا
یہ صبا نے خاک اُڑائی کیوں، یہ چٹک کے غنچے نے کیا کہا؟
مجھے وہم ہوتا ہے ہمنوا! کوئی بھید اِس میں ضرور تھا

وہ صبر دے کہ نہ دے جس نے بیقرار کیا؟
بس اب تمہیں پہ چلو ہم نے انحصار کیا

تمہارا ذکر نہیں ہے تمہارا نام نہیں
کیا نصیب کا شکوہ ہزار بار کیا

ثبوت ہے یہ محبت کی سادہ لوحی کا
جب اُس نے وعدہ کیا ہم نے اعتبار کیا

تاَل ھنے ہم جو دیکھا سکون و جنبش کا
تو کچھ سمجھ کے تڑپنا ہی اختیار کیا

مرے خدا نے مرے سب گناہ بخش دیے
کسی کا رات کو یُوں میں نے انتظار کیا

سنہ ۱۹۲۴ء

سحر ہوئی مسکرا رہا ہے، ہر اک ستارے میں نورِ تیرا
گلوں میں تیری شگفتگی ہے، صبا میں جوشِ سرور تیرا
ہر ایک دانہ ہے ماہ پیکر، ہر ایک ذرہ ہے رشکِ گوہر
کسے کہوں میں کہ یہ منظر مری نظر میں ہے نور تیرا
وقارِ دولت، شکوہِ طاقت کسی سے جھکتے نہیں جہاں میں
ہم اہلِ دل کی فسردگی میں بھرا ہوا ہے غرور تیرا
جنوں کے شانوں پہ کیوں پریشاں ہے زُلف اُس آفتِ جہاں کی
یہ رازِ دل ہے، نہ پا سکے گا کبھی دماغِ شعور تیرا
وہی ہوا، اور کیوں نہ ہوتا، کچھ ایسی اُفتاد ہی تھی دل کی
میں کہہ چکا تھا یہ اِک نہ اِک دن شکار ہوگا ضرور تیرا

سنہ ۱۹۲۵ء

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا
یہی تو ہیں دو ستونِ محکم، انھیں پہ قائم ہے نظمِ عالم

یہی تو ہے رازِ خُلد و آدم، نگاہ میری، شباب تیرا

صبا تصدّق ترے نفس پر، چمن ترے پیرہن پہ قرباں
شمیمِ دوشیزگی میں کیسا بسا ہوا ہے شباب تیرا

تمام محفل کے رُو برو گو اُٹھائیں نظریں، ملائیں آنکھیں
سمجھ سکا ایک بھی نہ لیکن، سوال میرا، جواب تیرا

ہزار شاخیں ادا سے لچکیں، ہوا نہ تیرا سا لوچ پیدا
شفق نے کتنے ہی رنگ بدلے، مِلا نہ رنگِ شباب تیرا

اِدھر مرا دل تڑپ رہا ہے، تری جوانی کی جُستجو میں
اُدھر مرے دل کی آرزو میں مچل رہا ہے شباب تیرا

کرے گی دونوں کا چاک پردہ، رہے گا دونوں کو کر کے رُسوا
یہ شورشِ ذوقِ دید میری، یہ اہتمامِ حجاب تیرا

جڑیں پہاڑوں کی ٹوٹ جاتیں، فلک تو کیا، عرش کانپ اُٹھتا
اگر میں دل پر نہ روک لیتا تمام زورِ شباب تیرا

بھلا ہوا جوش نے ہٹایا نگاہ کا چشمِ تر سے پردہ
بَلا سے جاتی رہیں گر آنکھیں، کھُلا تو بندِ نقاب تیرا

۱۹۲۵ء

"کیوں چھپ رہیں سب مریضِ محبت کو کیا ہُوا؟ ... اُن کا یہ پُوچھنا تھا کہ محشر بپا ہُوا
زحمت نہ ہو تو در پہ ذرا چل کے دیکھ لو ... آیا ہے کوئی اپنا پتا پُوچھتا ہُوا
یہ بیا سے ذوقِ بادہ کشی، اور یہ تشنگی! ... معبود! تیری شانِ کریمی کو کیا ہُوا؟
اک تم کہ اہلِ دل کی نظر پر چڑھے ہوئے ... اک میں کہ ہُوں خود اپنی نظر سے گرا ہُوا

شاعر کا دل، مناظرِ قدرت سے بے نیاز!!
پیغمبر، اور کلامِ خُدا سے پھرا ہُوا!!!

۱۹۲۶ء

خاک میں پیدا اگر اکسیر پیدا ہو جائے گا ... جس صنم کو عشق پُوجے گا خُدا ہو جائیگا
عشق بھی کیا شئے ہے تم جس شغل سے کھو گئے بط ... وہ ہماری زندگی کا مدّعا ہو جائیگا
عقل کہتی ہے غلط ہے ایک اک پیمانِ دوست ... عشق کہتا ہے کہ ہر وعدہ وفا ہو جائیگا
ہر تمنّا کے نکلنے پر نہ ہو اتنا مُصر ... ورنہ اپنی زندگی سے تُو خفا ہو جائیگا
تُم بھی آؤ، ورنہ کلیوں کا چٹکنا باغ میں ... میرے دل کے ٹوٹ جانے کی صدا ہو جائیگا

جوشؔ میرے حق میں جو بُت بن چکا تھا برہمن
کیا خبر تھی برہمن بنکر خدا ہو جائے گا

۱۹۲۶ء

پہچان گیا سیلاب ہے اس کے سینے میں ارمانوں کا
دیکھا جو سفینے کو میرے جی چھوٹ گیا طوفانوں کا

یہ شوخ فضا، یہ تازہ چمن، یہ مست گھٹا، یہ سرد ہوا
کافر ہے اگر اس وقت بھی کوئی رُخ نہ کرے میخانوں کا

یہ کس کی حیات افروز نظر نے چھیڑ دیا ہے عالم کو
ہر خاک کے ادنےٰ ذرّے میں ہنگامہ ہے لاکھوں جانوں کا

مطرب! بربط ہات سے رکھ دے، ماضی نے در کھول دیا
فریاد، کہ چبھ کر ٹوٹ گیا پھر کانٹا سا ارمانوں کا

ہاں ظلم و ستم سے بھی قدرے پڑتی ہیں خراشیں سینے میں
سب سے ہے مُہلک زخم مگر اے حُسن! ترے احسانوں کا

اے دینِ وفا! اے جانِ کرم! یُوں غم میں نہ میرا ہات بٹا
مر جاؤں گا میں اے شمع! خدارا، روپ نہ بھر پروانوں کا

دُنیا نے فسانوں کو بخشی افسُردہ حقائق کی تلخی
اور ہم نے حقائق کے نقشے میں رنگ بھرا افسانوں کا

کمبخت جوانی سینے میں ناگن کی طرح لہراتی ہے

ہر موجِ نفس اک طوفاں ہے کونین شکن ارمانوں کا
انگڑائی لگا، وٹ سے لے کر آنکھوں کو یہ کس نے گردش دی
کلیوں کو ٹھنڈے آئے پسینے، رنگ اڑا پیمانوں کا
اے جوشؔ ! جنوں کی شام و سحر میں، وقت کی یہ رفتار نہیں
داناؤں کی طولانی صدیاں، اور اک نفس دیوانوں کا

اُبھار کر مٹائے جا، بگاڑ کر بنائے جا — کہیں نزا چراغ ہوں جلائے جا، بجھائے جا
ہنوز شہریاریاں رہینِ کبروناز ہیں — مآلِ تاج و تخت کی کہانیاں سنائے جا
رُخِ نگارِ زندگی نقاب در نقاب ہے — نہ ہوگا ختم سلسلہ، مگر نقاب اٹھائے جا
جنوں کی شاہراہ سے نہ ہٹ سکا قدم مرا — خرد نے لاکھ دی صدا مجھے بھی آزمائے جا
فغاں، کہ مجھ غریب کو حیات کا یہ حکم ہے
سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب کھائے جا

سنہ ۱۹۲۴ء

ہٹ گئے دل سے تیرگی کے حجاب — آفریں اے نگاہِ عالمتاب
آڑے آیا نہ کوئی مشکل میں — مشورے دے کے ہٹ گئے احباب

کیا قیامت تھی صبر کی تلقین
اور بھی رُوح ہو گئی بے تاب

ہائے اُٹھے تو ناصحِ مشفق!
ہاں کدھر ہے صراحیٔ مئے ناب

ہاں اثر اب ہوا محبت کا
ہم سے آنے لگا ہے اُن کو حجاب

شب جو بیٹھے وہ میرے پہلو میں
مسکرانے لگی شبِ مہتاب

جوشِ شوق کھلتی تھی جن سے دل کی کلی
کیسے وہ لوگ ہو گئے نایاب

سنہ ۱۹۲۲ء

چاندنی میں آپ یاد آئے بہت
شب کو آنسو ہم نے ٹپکائے بہت

ہم، نہ آنا تھا، نہ آئے دام میں
ناز اِس دُنیا نے دکھلائے بہت

کل جو آئے وہ عیادت کو مری
سوچ کر کچھ جی میں پچھتائے بہت

سنہ ۱۹۲۹ء

مل گئی کشمکشِ تلخیٔ دوراں سے نجات
واہ کیا بات ہے اے دلبرِ شیریں حرکات

خاک پر نُور کی تحریر نظر آتی ہے
مجھکو ہیں عرش کے ٹوٹے ہوئے تارے ذرّات

عشق کی مشقِ تصوّر کو نہ ٹھکرا ظالم!
مجلسِ کفر نہیں، انجمنِ لات و منات

دیکھ گردُوں کے صحیفے کو اُلٹ کر اَوراق — جا نہ تاروں پہ کہ تارے تو فقط ہیں شذرات
جن کو کہتی ہے چٹکتے ہوئے غنچے دُنیا — میرے نزدیک ہیں اُس جانِ چمن کے کلمات
جوشؔ راتوں کی خموشی میں دمِ فکرِ سخن — نبضِ کونین کی سُنتا ہوں صدائے ضربات

کشتئ مے کو اے خدائے صبُوح — بخش دے قسمتِ سفینۂ نُوح
بخش اِس جسمِ پاک جوہر کو — مرگ فرسائی جلالتِ رُوح
چشمۂ زندگی ہو مدح سرا — ارغوانی شراب ہو ممدُوح
بادہ ہے اِس طرف، اُدھر کوثر — اِس کو فاتح بنا، اُسے مفتُوح

آنچ آئے نہ نَے پر اے معبُود!
تیرے بندے ہیں خستہ و مجروح

سنہ ۱۹۲۴ء

سامنے آسانیاں آتی ہیں دشواری کے بعد — رُوح کو ہوتی ہے صحت دل کی بیماری کے بعد
کھُلتے ہیں اِنساں پہ نیرنگئ قدرت کے راز — اشکِ خوں آلود سے چہرے پہ گلکاری کے بعد
کیوں جنوں ہم کو نہ ہوتا یہ ہے اک رسمِ قدیم — عقل سو جاتی ہے اکثر دل کی بیداری کے بعد

سب سے پہلے اس جفا پرور کا آتا ہے خیال
دفعتاً وقتِ سحر اے جوشؔ بیداری کے بعد

۱۹۲۲ء

ہوئی جاتی ہے زندگی برباد
اے مرے دیر آشنا! فریاد

ترک کر دو دل کا شغلِ مے، ناصح!
ہاں سر آنکھوں پر آپ کا ارشاد

اُن کی صرف اِک نگاہ کی خاطر
بیچ دی ہم نے عزتِ اجداد

جی کڑا کر کے حالِ دل اُن سے
اب تو کہتے ہیں، ہرچہ بادا باد

مست باش اے نگاہِ بادہ فروش
ہو گئے کتنے میکدے برباد

ہم بھی آخر خدا کے بندے ہیں
کوئی حد بھی ہے او ستم ایجاد؟

جوشؔ اپنی سحر پرستی سے
جاگ اُٹھی قسمتِ ملیح آباد

۱۹۲۴ء

آزاد منش رہ دُنیا میں، پروائے اُمیّد و بیم نہ کر
جب تک نہ ملیں فطرت کے قدم، خم دیکھ سرِ تسلیم نہ کر
سینے میں ہے اس کے سوز اگر، شیطاں کے قدم لے آنکھوں پر
بیگانۂ دردِ دل ہے اگر، جبریل کی بھی تعظیم نہ کر

کتنی ہی شعاعیں ابر میں ہوں، خورشیدِ جنوں پر ایماں لا
کتنے ہی دلائل روشن ہوں، دانش کو کبھی تسلیم نہ کر

سانچوں میں برابر ڈھلتا جا، رفتارِ جہاں سے پھیر نہ منہ
تنسیخ نہ کر، اس دفتر میں جینا ہے تو کچھ ترمیم نہ کر

اے جوشؔ ہجومِ کلفت میں فریاد و فغاں سے کام نہ لے
گھٹ جائے گا اس سے دل کا اثر، اجزائے تپش تقسیم نہ کر

سنہ ۱۹۲۴ء

عشووں کو چین ہی نہیں آفت کئے بغیر
تم اور مان جاؤ شرارت کئے بغیر؟

اہلِ نظر کو یار دکھاتا رہِ وفا
اے کاش ذکرِ دوزخ و جنت کئے بغیر

اب دیکھ اس کا حال، کہ آتا نہ تھا قرار
خود تیرے دل کو جس پہ عنایت کئے بغیر

اے ہم نشیں محال ہے ناصح کا ٹالنا
یہ اور یہاں سے جائیں نصیحت کئے بغیر!!

تم کتنے تند خو ہو کہ پہلو سے آج تک
اک بار بھی اٹھے نہ قیامت کئے بغیر

چلتا نہیں ہے محفلِ حسنِ جواں میں کام
ہر جنبشِ نظر سے عبادت کئے بغیر

مانا کہ ہر قدم پہ قیامت ہے پھر بھی جوشؔ
بنتا نہیں کسی سے محبت کئے بغیر

سنہ ١٩٢٥ء

ہلال سر پہ ہے، بیٹھا ہوں کیف میں سرشار — خموش رات کے جنبش میں ہیں لبِ گفتار

مرے ضمیر میں کچھ دن سے ہے وہ کیفیت — فرازِ چرخ پہ جس طرح صبح کے آثار

ہوا کی رو میں کئی دن سے کہہ رہا ہے کوئی — کہ تجھ سے رازِ دو عالم ہے مائلِ گفتار

میں ہوں تو ذرّہ خاکی مگر وہ ذرّہ ہوں — جو آفتاب سے رہتا ہے برسرِ پیکار

ازل سے گرمِ عمل گو ہے مذہبِ اخلاق — فغاں کہ آج تک انسانیت ہے سینہ فگار

اُس انجمن میں ہے زاہد تجھے غرورِ صلوٰۃ — ق — جس انجمن میں ہے عصمت کو جرم کا اقرار

خدا کی شان، وہاں نازِ پاکدامانی — جہاں زبانِ رسالت ہے محوِ استغفار

وہ رُوح، سینۂ عالم میں ہے جو خوابیدہ
خُدا کا شُکر کہ میرے نفس میں ہے بیدار

سنہ ١٩٢٣ء

بہ ہنر تو بھی ہے ہنستا رہ، تو کوہ ہے، خود کو کاہ نہ کر
یہ بن نہ پڑے تو کم سے کم، خاموش ہی رہ، اور آہ نہ کر
کچھ دن میں یہ دُنیا غش کھا کر قدموں پہ ترے جُھک جائیگی
غوغائے مصائب سے نہ جھجک پروائے غمِ جانکاہ نہ کر

جو قلب پہ عالم طاری ہو، کچھ عقل کو اُس میں راہ نہ دے
اِن رُوح کے گہرے رازوں سے اپنے کو بھی تُو آگاہ نہ کر

سنہ ۱۹۲۲ء

اے قیامت نگاہ و برقِ جمال — خونِ اہلِ نظر ہے تجھ کو حلال
دلِ آشفتہ کار کے ہاتھوں — زندگی ہم کو ہوگئی ہے وبال
آنکھیں پھر جوش ڈھونڈتی ہیں اُنھیں
گل سے پھر مست ہے نسیمِ شمال

سنہ ۱۹۲۱ء

آستاں پر جب کسی کافر کے جُھک جاتا ہے دل — اپنے سجدے کا، حرم کو حکم فرماتا ہے دل
سخت حیراں ہوں کہ ہستی کے بلند و پست سے — کتنی آہستہ خرامی سے گزر جاتا ہے دل
آنے والا ہے یکایک کیا مسرت کا پیام؟ — بیٹھے بیٹھے آج کیوں میرا ابھر آتا ہے دل
اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں قدسی، کانپنے لگتا ہے عرش — جب کسی معشوق کا عاشق پہ آجاتا ہے دل
ہم نشیں! الفاظ میں تشریح ہو سکتی نہیں — کیا بتاؤں کس طرح راتوں کو گھبراتا ہے دل
سچ بتا اے ہمنشیں! کیا عشق اسی کا نام ہے؟ — سانس کے ہمراہ سینے سے اُڑا جاتا ہے دل
ایسے سجدے بھی کبھی دیکھے ہیں اے فرشِ حرم؟ — سر تو کیا، اُن کی طرف میرا اُجھکا جاتا ہے دل

آہ یہ دُنیا !! کہاں ہے موت ؟ او کمبخت موت!
میرا اِس ویران آبادی میں گھبراتا ہے دل

سنہ ۱۹۲۱ء

اُن سے جاکر صبا یہ کہہ پیغام
نیند راتوں کی ہو گئی ہے حرام

اے فدا تجھ پہ دین و دل میرا
جلوہ گستر ہو میرے ماہِ تمام

یہ چلا کون اُٹھ کے پہلو سے ؟
دل کی بستی میں پڑ گیا کہرام

جتنے آشفتہ حال شہر میں ہیں
جوشؔ کو مانتے ہیں اپنا امام

سنہ ۱۹۲۶ء

بازو ملا کے اڑتے ہیں روح الامیں سے ہم
کرتے ہیں سیرِ عالمِ بالا یہیں سے ہم

لب اپنے بند رکھتے ہیں غوغائے عام میں
کھلتے ہیں نکتہ سنج و سُخن آفریں سے ہم

اے ساکنانِ دیر و حرم ! کہہ رہے ہو کیا ؟
باہر کھڑے ہیں حلقۂ دُنیا و دیں سے ہم

اے غنچۂ صباح ! نہ یوں مُسکرا کے دیکھ
واقف ہیں اُن کے خندۂ ناز آفریں سے ہم

دامن کسی کا ہات میں آکر نکل گیا
بیٹھے پسینہ پونچھ رہے ہیں جبیں سے ہم

شکرِ خُدا کہ اتنے مصائب کے باوجود
واقف نہیں ہیں خاطرِ اندوہگیں سے ہم

اہلِ جہاں! ہمارا نشیمن ہے آسماں — نا آشنا ہیں رسم و رواجِ زمیں سے ہم
ہم بیکسوں کی شان کبھی میکدے میں دیکھ — کرتے ہیں ناز جب فلکِ ہفتمیں سے ہم
معنی بپھا رہا ہے ہر اک اپنے طور پر
کیا جوشؔ کہہ گئے نگہِ واپسیں سے ہم

سنہ ۱۹۲۳ء

اپنی ان انکھڑیوں کی تجھ کو قسم — ہاں ادھر بھی کبھی نگاہِ کرم
آنے والی ہے کیا بلا سر پر — آج پھر دل میں درد ہے کم کم
لذّتِ مرگ، اے معاذ اللہ — وائے بر خضر و عیسیٰ مریم
یُوں بھی اے دل کوئی دھڑکتا ہے — کاکلیں اُن کی ہو گئیں برہم
تیری رفتارِ ناز کے قرباں — بنتے ہیں میرے دل پہ نقشِ قدم
یُوں نہ چھیڑو کہ ہات سے کھو کر — پھر بہت تم کو یاد آئیں گے ہم
چین سے بیٹھنے نہیں دیتی
جوشؔ اس دل کی کاوشِ پیہم

سنہ ۱۹۲۲ء

ترے سنگِ در نے بدل دیا ہے یہ پستیوں کو فراز میں
کہ ہزار طور جھلک رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

مرا پیرہن نہیں چاک ابھی مجھے رحم کھا کے سنگھا بھی دے
یہ مہک جنوں کی بھری ہوئی ہے جو تیری زلفِ دراز میں

یہ وفا کا رنگ شکستہ ہے، مری حسرتوں کا یہ خون ہے
یہ گلاب کی سی جو سرخیاں ہیں ترے تبسّمِ ناز میں

یہ ترے غرور کو کیا خبر کہ ازل کے روز سے دخل ہے
مرے عشقِ سادہ مزاج کو ترے حسنِ عشوہ طراز میں

چمک اے حقیقتِ دلستاں مجھے تازہ سانچے میں ڈھال دے
میں وہ شمع ہوں جو پگھل چکی ہے تمام بزمِ مجاز میں

جو بہارِ عشق ہو دیکھنا، کبھی غزنوی پہ نگاہ کر
کہ شمیمِ گلشنِ خسروی ہے تباہ کوئے ایاز میں

نظر آئینے پہ ہے، انکھڑیوں میں طلوعِ صبح کا رنگ ہے
وہ بجھا کے شمع سنور رہے ہیں سحر کو خلوتِ ناز میں

یہ ستارہ سحری کی ضو ہے اُفق کی سُرخ بساط پر
کہ دلِ نیاز دھڑک رہا ہے کسی کے پہلوئے ناز میں

مجھے ان کا محرمِ راز کر انہیں میرے واسطے کھول دے
یہ جو خط سے تیری جبیں پہ ہیں، یہ جو خم ہیں زُلفِ دراز میں

جو صنم کدوں میں بیاں کروں، تو صنم بھی سجدوں میں گر پڑیں
وہ ملا ہے پچھلے پہر مزا مرے دل کو جوشِ نماز میں

سنہ ۱۹۲۶ء

جہنّم سرد ہے جنّت کے در کھلوائے جاتے ہیں
سرِ محشر پجاری حُسن کے بلوائے جاتے ہیں

غضب ہے یہ ادا اُن کی دمِ آرائشِ گیسو
جھکی جاتی ہیں آنکھیں خود بخود شرمائے جاتے ہیں

طلسمِ دہر کے اسرار کھل جائیں عجب کیا ہے
اب اپنے دل کے کچھ آثار ایسے پائے جاتے ہیں

سحر کی ضو، شفق کی سُرخیاں، برسات کے بادل
مجھے مسرور پا کر یہ مناظر دکھائے جاتے ہیں

نہ جانے کتنی رنگیں صحبتیں ہیں میری نظروں میں
بس اے مُطرب! مری آنکھوں میں آنسو آئے جاتے ہیں

شبِ وعدہ یہ کیسی تیرگی ہے، وقت کیا ہوگا؟
تمنّاؤں کے غنچے ہر نفس کمھلائے جاتے ہیں

کوئی حد ہی نہیں اس احترامِ آدمیّت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

بہت جی خوش ہوا اے ہمنشیں کل جوشؔ سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

سنہ ۱۹۲۱ء

سمجھے گا اُس کا درد کون شورشِ کائنات میں
تو نے جِسے مٹا دیا پردۂ التفات میں

آنکھیں تری اُداس ہیں حسرتِ عشوہ دے انہیں
برقِ نظر چھپی ہے کیوں ابرِ تکلفات میں

سانس میں لوٹتے بادہ ہے سجدے ہیں پاتے بار بار
اب بھی دماغِ زُہد کو شک ہے مری نجات میں

تاروں کی جھلکیوں ہی پر کیجئے کیوں نہ اکتفا
ڈھونڈئیے آفتاب کیوں جوشؔ اندھیری رات میں

سنہ ۱۹۲۶ء

آنکھیں ہتھیلیوں سے مَل نیند ہے چشمِ ناز میں
بھر دے حنا کا رنگ بھی نرگسِ نیم باز میں

چھیڑوں کبھی جو رات کو تاروں سے خوں ٹپک پڑے
درد بھرا ہوا ہے وہ دل کے شکستہ ساز میں

میرے گدازِ عشق کا تم پہ اثر ہوا ضرور
ناز کا رنگ آچلا میرے دلِ نیاز میں

دیکھنا ٹوٹنے پہ ہے جوشؔ کا دل بھی عنقریب
ذکر تھا کل یہ حسن کے خلوتیانِ راز میں

سنہ ١٩٢٥ء

یہ ہم جو تابشِ حسنِ بشر کو دیکھتے ہیں — کسے خبر کہ خود اپنی نظر کو دیکھتے ہیں

وہ داغِ سینۂ شاعر کو دیکھ سکتے کاش — جو لوگ شعر کے عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

قفس کے دیکھنے والے بڑی حقارت سے — پلٹ پلٹ کے مرے بال و پر کو دیکھتے ہیں

برا ہو وہم کا، لکھا تو ہے انہیں خطِ شوق — اداس ہو کے مگر نامہ بر کو دیکھتے ہیں

ہمیں نہیں ہے کچھ اعمالِ جوش سے مطلب
کہ ہم تو صرف متاعِ ہنر کو دیکھتے ہیں

سنہ ١٩٢٣ء

پابندِ عشق بستۂ دامِ ہوا نہیں — صد شکر، دل میں اب خلشِ مدعا نہیں

گمراہ ہو نہ جاؤں میں اے حسنِ بے نقاب — اس خیرگی میں مجھ کو تو کچھ سوجھتا نہیں

کس حد کا دلنشیں ہے محبت کا بھی سبق — اک بار جس کو یاد ہوا بھولتا نہیں

ساقی نگاہِ کم سے ہمیں دیکھتا ہے جو — دراصل وہ غریب ہمیں جانتا نہیں

اس نامرادِ عشق کی تلخی کو کیا کروں — ہر چند جس سے کام ہے وہ بیوفا نہیں

واقف ہے جوش عشق سے اپنے تمام شہر
اور ہم یہ جانتے ہیں کوئی جانتا نہیں

سنہ ١٩٢٤ء

یہ بات، یہ تبسم، یہ ناز، یہ نگاہیں   آخر تمہیں بتاؤ کیونکر نہ تم کو چاہیں

اب سر اٹھا کے میں نے شکووں سے ہاتھ اٹھایا   مر جاؤں گا ستمگر نیچی نہ کر نگاہیں

کچھ گل ہی سے نہیں ہے روحِ نمو کو رغبت   گردن میں خار کی بھی ڈالے ہوئے ہے باہیں

اللہ ری دلفریبی جلووں کے بانکپن کی   محفل میں وہ جو آئے کج ہو گئیں کلاہیں

یہ بزم، ہوش، کس کے جلووں کی رہگزر ہے

ہر ذرہ میں ہیں غلطاں اٹھتی ہوئی نگاہیں

سنہ ١٩٢٣ء

✓ اے شوق، مجھے گمراہ نہ کر، شورش کیلئے اسباب نہیں

امید کہ اجڑے گلشن میں اک پھول بھی اب شاداب نہیں

اب عشق کا چہرہ کیا دیکھوں اے حسن، ترے آئینے میں

احساس کی آنکھیں دھندلی ہیں، امید کے رخ پہ آب نہیں

اب دل کا سفینہ کیا ابھرے، طوفاں کی ہوائیں ساکن ہیں

اب بحر سے کشتی کیا کھیلے، موجوں میں کوئی گرداب نہیں

پھر جوشؔ فسردہ خاطر ہے، اے عہدِ تمنّا واپس آ
آسائشیں کھائے جاتی ہیں، تمکین کی دل کو تاب نہیں

سنہ ۱۹۲۲ء

دیر سے منتظر ہوں میں، بیٹھ نہ یوں حجاب میں
تاروں کی چھاؤں ہے ذرا آ میرے دلِ خراب میں

کس سے کہوں میں داستاں طولِ شبِ فراق کی
جاگ رہا ہوں ایک میں سارا جہاں ہے خواب میں

اُس سے ڈرو وُہ فتنۂ بزمِ جہان ہے جسے
شیب میں تابِ مے نہ ہو عشق نہ ہو شباب میں

عرش سے آئی یہ صدا، بخش دیئے ترے گناہ
یاد کیا کسی کو یُوں کل شبِ ماہتاب میں

یُوں تو حریمِ ناز میں کتنے ہی دل ہوئے تھے پیش
حکمِ شکستگی ہوا میرے ہی دل کے باب میں

مضطر و بے قرار ہوں جوشؔ وُہ خود مرے لئے
کاش اِک ایسی رَو بھی ہو دھڑکے انقلاب میں

سنہ ۱۹۲۱ء

زمانے کا خُدا حافظ کہ جتنے دل ہیں چھالے ہیں
وُہ اب الفاظ بن کر میرے لب تک آنے والے ہیں

کہیں آبادی و صحرا میں جی اپنا نہیں لگتا
بتا اے وحشتِ دل! ہم کہاں کے رہنے والے ہیں

بگولے اُٹھ رہے ہیں، دیدۂ حیراں، نظارہ کر
نہیں معلوم ان میں کس قدر نازوں کے پالے ہیں

ٹھہر، بنیاد ہے انسانیت کی "صبر و تمکیں" پر
یہ وُہ کہتا ہے جس نے زلزلے رُوحوں میں ڈالے ہیں

۱۹۲۱ء

ظالم! یہ خموشی بے جا ہے، اقرار نہیں، انکار تو ہو
اِک آہ تو نکلے توڑ کے دِل، نغمے نہ سہی، جھنکار تو ہو

ہر سانس میں صد ہا نغمے ہیں، ہر ذرّے میں لاکھوں جلوے ہیں
جاں محوِ رموزِ ساز تو ہو، دل جلوہ گہِ انوار تو ہو

شاخوں کی لچک ہر فصل میں ہے، ساقی کی جھلک ہر رنگ میں ہے
ساغر کی کھنک ہر ظرف میں ہے، مخمور تو ہو، سرشار تو ہو

کیونکر نہ شبِ مہ روشن ہو، کیوں صُبح نہ دامن چاک کرے
کچھ وصفِ رموزِ حُسن تو ہو، کچھ شرحِ جمالِ یار تو ہو

سینے میں خطائیں مضطر ہیں، انعام کا وہ اقرار کریں
مَنصُور ہزاروں اب بھی ہیں، اے جوشؔ صِلے میں دار تو ہو

۱۹۲۲ء

نُور رگوں میں دَوڑ جائے، پردۂ دل جلا تو دو / دیکھنا رقص پھر مرا، پہلے نقاب اُٹھا تو دو
رنگ ہے زرد کیوں مرا، حال ہے غیر کس لئے؟ / ہو جو بڑے ادا شناس اس کا سبب بتا تو دو
میرے مکاں میں تم مکیں، میں ہوں مکاں سے بےخبر / ڈھونڈھ ہی لُونگا میں تمہیں، مُجھکو مرا پتا بتا تو دو

ہو، کہ نہ ہو مجھے سکوں، یہ تو خدا کو علم ہے — نزع میں آ کے سامنے ناز سے مسکرا تو دو

لطف نہیں، جفا سہی، زیست نہیں، قضا سہی — غمزۂ ناروا سہی، عشق کا کچھ صلا تو دو

تم کو غرور ناز ہے، تم ہو تغافل آشنا — اچھا اگر یہ بات ہے، دل سے مجھے بھلا تو دو

اس سے تمھیں غرض نہیں، پھلنے لگے کہ جل اٹھے
نخلِ حیات جوش پر، برقِ نظر گرا تو دو

سنہ ۱۹۲۶ء

اس بات کی نہیں ہے کوئی انتہا، نہ پوچھ — اے مدعائے خلق! مرا مدعا، نہ پوچھ

کیا کہہ کے پھول بنتی ہیں کلیاں گلاب کی؟ — یہ راز مجھ سے بلبلِ شیریں نوا، نہ پوچھ

جتنے گدا نواز تھے، کب کے گزر چکے — اب کیوں بچھائے بیٹھے ہیں ہم بوریا، نہ پوچھ

پیشِ نظر ہے پست و بلندِ رہِ جنوں — ہم بے خودوں سے قصۂ ارض و سما، نہ پوچھ

سنبل سے واسطہ، نہ چمن سے مناسبت — اس زلفِ مشکبار کا حال، اے صبا، نہ پوچھ

صد محفلِ نشاط ہے، اک شعرِ دل نشیں — اس بربطِ سخن میں ہے کس کی صدا، نہ پوچھ

کر رحم میرے جیب و گریباں پہ ہم نفس! — چلتی ہے کوئے یار میں کیونکر ہوا، نہ پوچھ

رہتا نہیں ہے دہر میں جب کوئی آسرا — اس وقت آدمی پہ گزرتی ہے کیا، نہ پوچھ

ہر سانس میں ہے چشمۂ حیوان و سلسبیل — پھر بھی میں تشنہ کام ہوں، یہ ماجرا، نہ پوچھ

بندہ ترے وجود کا منکر نہیں، مگر
دنیا نے کیا دیئے ہیں سبق؟ اے خدا، نہ پوچھ

کیوں جوشؔ، رازِ دوست کی کرتا ہے جستجو
کہہ دو کوئی کہ شاہ کا حال اے گدا، نہ پوچھ

سنہ ۱۹۲۶ء

غرورِ اہلِ زمانہ سے گیر و دار، نہ پوچھ
دماغِ کبرِ گدایانِ کوئے یار، نہ پوچھ

بساطِ عالمِ امکاں الٹ نہ جائے کہیں
نہ پوچھ، بہرِ خدا شرحِ حسنِ یار، نہ پوچھ

ٹپکنے لگتے ہیں کیوں اشک خندۂ گل سے؟
یہ رازِ دوست ہے، اے نکہتِ بہار، نہ پوچھ

ہوا غروب کی، ساحل پہ جب سنکتی ہے
دلِ حزیں میں محبت کا خلفشار، نہ پوچھ

عذابِ قبر پہ ہنستا ہوں مختصر یہ ہے
کشاکشِ غمِ شبہائے انتظار، نہ پوچھ

سوائے حسن، اٹھاتا نہیں کسی کا بھی ناز
نزاکتِ دلِ اربابِ انکسار، نہ پوچھ

سنہ ۱۹۲۶ء

دل پہ وہ زخم کھائے ہیں کہ نہ پوچھ
لطف بھی وہ اٹھائے ہیں کہ نہ پوچھ[ط]

ان کی رفتار نے زمانے میں
ایسے فتنے جگائے ہیں کہ نہ پوچھ

میرے سینے میں ذوقِ تمکیں نے
وہ تلاطم مچائے ہیں کہ نہ پوچھ

اس شعر کے کہنے کے بعد مجھ سے کہا گیا کہ اس کا دوسرا مصرع داغ کے ایک مصرع سے کسی قدر قریب ہے۔ مگر شعر کہتے وقت چونکہ مجھے اس کا علم نہ تھا۔ اسلئے اسے باقی رہنے دیا گیا۔

عشق کی بے خودی کے عالم میں ہم نے وُہ بھید پاتے ہیں کہ نہ پُوچھ
صرف اک حسرتِ تبسّم میں اتنے آنسو بہائے ہیں کہ نہ پُوچھ
حُسنِ کافر نے اپنے قدموں پر اِتنے مومن جھکاتے ہیں کہ نہ پُوچھ
ہم نے آرام کی تمنّا میں اِتنے صدمے اُٹھائے ہیں کہ نہ پُوچھ
جوشؔ اُن انکھڑیوں کی بجلی نے
اتنے خرمن جلائے ہیں کہ نہ پُوچھ

۱۹۲۱ء

آزمانا اگر ہے تیرِ نگاہ یہ جگر ہے، یہ دل ہے، بسم اللہ
خون رو، اے دلِ تہی پہلو یہ کنارِ شفق میں جلوۂ ماہ
فتنۂ خلق، تیری زُلفِ دراز محشرِ ناز، تیری چشمِ سیاہ
ہم نشیں! تو محال کہتا تھا دیکھ، کرتے ہیں اس طرح سے نباہ
بس یہ مقصود ہے دو عالم سے تیرا جلوہ ہو اور میری نگاہ
کچھ تو فرمائیے پئے تسکیں یُوں نہ دامن چھڑائیے للّٰلہ
ہجر ہے، اور بقیدِ حیات بخش دے اے خُدا! یہ میرا گناہ
لُطف کی اک نگاہ، اے جاناں! جوشؔ ہے تیرا بندۂ درگاہ

سنہ ۱۹۲۶ء

نگاہِ گرم سے حالت ہو دل کی اور تباہ
ترا یہی ہے ارادہ اگر تو بسم اللہ

غضب ہے عارضِ رنگیں پہ چاندنی کی بہار
لبوں پہ کھیل رہا ہے تبسمِ شبِ ماہ

سرہانے مجھ کو جو دیکھا تو آنکھ کھلتے ہی
وہ مسکرائے جبیں سے ہٹا کے زلفِ سیاہ

نہ کیوں ہو طاعتِ بے روح سے بلند اے شیخ
اگر خلوص کی جنسیا دپہ ہے کوئی گناہ

اٹھائی یار نے کیوں قیدِ "سمت" و "شرطِ جہت"
کہیں ٹھہر نہیں سکتی اب اہلِ دل کی نگاہ

جحیم و خلد کسی کی بھی کچھ نہیں چلتی
عطا کیا ہے بشر کو یہ کس نے ذوقِ گناہ؟

پرکھتے کاش وہ رہروِ کے ذوقِ منزل کو
سمجھ رہے ہیں جو گم کردہ راہ کو "گمراہ"

نہ کھا فریبِ سخن، خواجۂ بزرگ نہاد!
کہ جوشؔ اصل میں ہے ایک رندِ نامہ سیاہ

سنہ ۱۹۲۶ء

نہیں شراب تو ہنگامۂ بہار نہ دیکھ
جو دل میں تاب نہ ہو آپ رُخِ یار نہ دیکھ

خدا کو مان، یہ گُل گشتِ ستم قاتل ہے
مفارقت میں سوئے ماہ و جوئبار نہ دیکھ

سفر نشاط سے خالی رہے گا آخر تک
چلا ہے گھر سے تو مُڑ مُڑ کے بار بار نہ دیکھ

ہزار دے کوئی تجھ کو فریبِ آزادی
نگاہِ جبر پہ رکھ سوئے اختیار نہ دیکھ

جو ایک بار نہ دیکھیں تری طرف زردار — تجھے خدا کی قسم تُو ہزار بار نہ دیکھ

محلِ شرم ہے اے خواجہ! وقتِ بذل و سخا — سُوئے نگاہِ گدایانِ شرمسار نہ دیکھ

اگر بہار کے بے خوف لُوٹتا ہیں مزے — اُلٹ کے دفترِ مستقبلِ بہار نہ دیکھ

اگر حیات کی تعمیر ہے تجھے منظور
نکل کے شہر سے ٹُوٹے ہُوئے مزار نہ دیکھ

سنہ ۱۹۱۷ء

اے ہمنشیں! یہ قصّۂ وحشت فزا نہ پُوچھ — دل کس طرح بنا دلِ بے مدّعا نہ پُوچھ

غارت گروں کی سستیِ پیماں دلا نہ یاد — سنگیں دلوں کے وعدۂ صبر آزما نہ پُوچھ

لب ہائے نازکے سخنِ ناسزا نہ سُن — چشمِ سیاہ کے ستمِ نارَوا نہ پُوچھ

قصّہ ہے دردناک دلِ داغ داغ کا — کیونکر "یہ ماہتاب" بنا ہے "سہا"؟ نہ پُوچھ

طے کر چکا ہوں عشق کی جس راہِ صعب کو — اُس راہ کی کشاکشِ بیم و رجا نہ پُوچھ

اب تک وہ دل میں آگ بھری ہے کہ الاماں — کس طور سے یہ خاک بنی کیمیا؟ نہ پُوچھ

پہلو سے اپنے جوشؔ کو تاروں کی چھاؤں میں
آتی ہے کس نگار کی آوازِ پا؟ نہ پُوچھ

سنہ ۱۹۲۱ء

جاں بلب ہوں فراق کے مارے　　چار دن کی ہے زندگی پیارے!
اے مرے وعدہ بھولنے والے　　ڈوبنے کے قریب ہیں تارے
جوشؔ سے کل جو نام اک پوچھا
ہوگیا زرد شرم کے مارے

سنہ ۱۹۲۲ء

دل کا رونا ہے دل کا ماتم ہے　　اب تو ہر سانس نوحۂ غم ہے
میرا صدموں میں مسکرا دینا　　بدتر از صد ہزار ماتم ہے
دیکھ، وہ دل نہ توڑ او ظالم　　رازِ کونین کا جو محرم ہے
یاد اُن کی بہت نہیں آتی　　شاید اب دل کی زندگی کم ہے
خونِ دل کی ہر ایک بوند میں جوشؔ
وسعتِ عرصۂ دو عالم ہے

سنہ ۱۹۲۲ء

شاہدِ مے سے آشنائی ہے[1]　　اپنی مشہور پارسائی ہے
حسن کو رام کر کے چھوڑوں گا　　مجھ سے دل نے یہ قسم کھائی ہے

---

[1] کسی نے کہا تھا یہ مطلع حسرت موہانی کے کسی شعر سے ملتا جلتا ہے لیکن یہ مطلع کہتے وقت میرے ذہن میں حسرت کا وہ شعر نہ تھا

آپ سے ہم سے، رنج ہی کیسا   مسکرا دیجئے، صفائی ہے

آئی عاشق میں شانِ محبوبی   یعنی اب عشق انتہائی ہے

حد ہے اپنی طرف نہیں میں بھی

اور اُن کی طرف خدائی ہے

۱۹۲۷ء

فقط اک جامِ دستِ مہ وشاں سے   فزوں ہے دولتِ کون و مکاں سے

خدائی خود مجھے آواز دے گی   کِسے امید تھی عشقِ بتاں سے

خدا کے فضل سے ہوں وہ بلا نوش   سبک ہوتا نہیں رطلِ گراں سے

نہ پوچھو کیفیت کے عالم میں کیا کیا   الجھتا ہوں زمین و آسماں سے

کلی بن کر نہ اتنا ناز فرما   کوئی کہہ دو یہ خاکِ بوستاں سے

نقاب اٹھتی نہیں چہرے سے اُن کی   مجھے اٹھنا پڑے گا درمیاں سے

مجھے خود ڈھونڈتے پھرتے تھے جلوے   وہ دل اب ڈھونڈھ کر لاؤں کہاں سے

وہ اک پل، جو ترے پہلو میں گزرے   گراں قیمت ہے عمرِ جاوداں سے

زمیں ہے رقص میں گردش میں افلاک   مرے دورِ شرابِ ارغواں سے

مری عصیاں کی راتیں ہیں منور   چراغِ محفلِ روحانیاں سے

قیامت تھی خدا کی بے نیازی — مدد لینا پڑی عشقِ تپاں سے
اُتر آئیے، کہو، خود ہی زمیں پر — بُلاتا ہے مجھے کیوں آسماں سے
پتا منزل کا ہم کو تو ملا ہے جوشؔ
بغاوت کر کے میرِ کارواں سے

سنہ ۱۹۲۲ء

کر چکا سیرِ اصل مرکز پر اب آنا چاہیئے — تجھ کو اپنے دل میں اک دُنیا بسانا چاہیئے
رسمِ عالم پر نہ جا، دیکھ اپنی افتادِ مزاج — دہر کو اپنی روِش پہ کھینچ لانا چاہیئے
کھیل ہے کیا آفتابِ رازِ ہستی کا سُراغ؟ — ذرّے ذرّے کے جگر میں ڈوب جانا چاہیئے
کچھ سُنا کیا کہہ رہے ہیں نکتہ سنجانِ حیات؟ — جس قدر ہو دل کی بے چینی بڑھانا چاہیئے
جلوۂ خود بیں کے آگے پیش کرتا ہے دماغ! — آئینہ ٹوٹے ہوئے دل کا دکھانا چاہیئے
اس سے تیرے حُسنِ بے پردہ پہ حرف آئیگا دیکھ — حشر کے دن بھی نہ مجھ کو ہوش آنا چاہیئے
یہ حبابِ جُوئے دل ہے نطق سے اسکو نہ چھیڑ — غم کے افسانے کو آنکھوں سے سنانا چاہیئے
خواہ کتنی ہی مسرت ہو تبسم ننگ ہے — ہاں جب آنسو کوئی ٹپکے مسکرانا چاہیئے
راہِ دل میں خضر کی حاجت نہیں تنہا نکل — بڑھ کے اپنا ساتھ بھی پھر چھوڑ جانا چاہیئے
اوّل اوّل بھول جا ہر شے بجز یادِ حبیب — آخر آخر یاد بھی دل سے بھلانا چاہیئے

تیرا کہنا ہو گیا، لے میں نے آنکھیں پھوڑ لیں — اب تو بزمِ ناز کا پردہ اٹھانا چاہیے

کچھ نہ رہ جائے بجز یک شعلۂ عالم فروز
اس طرح اجزائے ہستی کو جلانا چاہیے

۱۹۲۷ء

قدم انساں کا راہِ دہر میں تھرّا ہی جاتا ہے — چلے کتنا ہی کوئی بچ کے ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

نظر ہو خواہ کتنی ہی حقائق آشنا پھر بھی — ہجومِ کشمکش میں آدمی گھبرا ہی جاتا ہے

خلافِ مصلحت میں بھی سمجھتا ہوں مگر ناصح! — وہ آتے ہیں تو چہرے پر تغیّر آ ہی جاتا ہے

ہوائیں زور کتنا ہی لگائیں آندھیاں بن کر — مگر جو گھر کے آتا ہے وہ بادل چھا ہی جاتا ہے

شکایت کیوں اسے کہتے ہو، یہ فطرت ہے انساں کی — مصیبت میں خیالِ عیشِ رفتہ آ ہی جاتا ہے

شگوفوں پر بھی آتی ہیں بلائیں یوں تو کہنے کو — مگر جو پھول بن جاتا ہے وہ کمھلا ہی جاتا ہے

سمجھتی ہیں مآلِ گل، مگر کیا زورِ فطرت ہے
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسّم آ ہی جاتا ہے

۱۹۲۷ء

باتوں میں سرد مہری آنکھوں میں مہربانی — کس نے سکھائے ہیں یہ آئینِ دلستانی؟

ہر اک نفس کو میرے صد موجِ برق دیکھو — بخشی ہے تو نے دل کے خرمن کو پاسبانی

رکھی ہے اسے سبک سر! معمارِ زندگی نے	دل کی شکستگی پر بنیادِ شادمانی
پھر جشنِ نو کا شاید کہنا ہے خیر مقدم	دل سے گزر رہی ہے اک موجِ کامرانی
فطرت، مآلِ سعیِ باطل پہ ہنس رہی ہے	مذہب بنا رہا ہے قانونِ زندگانی
نبضیں چھُٹی ہوئی ہیں ساون کے بادلوں کی	اللہ ری تیری کافر اُٹھتی ہوئی جوانی
پہلو میں تیرے اکثر مجھکو ہوا یہ دھوکا	میں ہوں اُلوہیت کا اک جزوِ غیر فانی

اے جوشؔ ہند اب تک محرومِ رنگ و بُو ہے
صدیاں ابھی نہ ہوگی شاعر کی قدر دانی

۱۹۲۱ء

افشائے رازِ عشق کا ساماں کئے ہوئے	پھر آگئے وہ بال پریشاں کئے ہوئے
پھر نشتر تبسم کوئی نکلا ہے ڈبیہ سے	آہنگِ آزمائشِ ایماں کئے ہوئے
پھر بڑھ رہا ہے میری طرف مطربِ جنوں	صحرا کو اپنے ساتھ غزلخواں کئے ہوئے
پھر مست چل رہی ہے ہوا کوہ و دشت میں	ہر شے کو اپنی رو میں گلستاں کئے ہوئے
خنجر بکف بڑھا ہے مری سمت پھر جمال	کتنی تک اپنے ہاتھوں کو عریاں کئے ہوئے
پھر آئے ہیں وہ سامنے اُلٹے ہوئے نقاب	سو طور اک نگاہ میں پنہاں کئے ہوئے
پھر اُس نے آکے کفر کا اقرار لے لیا	مدت ہوئی تھی دل کو مسلماں کئے ہوئے

پھر آئے ہیں وہ جوشؔ سوئے مجرمانِ عشق
شعلے کی طرح تیغ کو عریاں کیے ہوئے

سنہ ۱۹۲۵ء

کہوں تو کون مانے گا کہ فیضِ چشمِ گریاں سے
طرب کے پھوٹنے لگتے ہیں چشمے رُوحِ انساں سے

دکھاؤں اپنی فطرت کے نوادر کس توقع پر
کہ اس بازار میں راضی ہیں گاہک جنسِ ارزاں سے

صداقت میرے سر آنکھوں پہ لیکن واقعہ یہ ہے
خدا کو میں نے پہچانا ہے نورِ صبحِ خنداں سے

الٰہی! یہ جواں چشم و چراغِ بزمِ عالم ہو
بصارت چھین کر جو لے چلا ہے پیرِ کنعاں سے

ربابِ زندگی میں جس کے چھو جانے سے لرزش ہے
وہ ناخن کھیلتا ہے ہر نفس میری رگِ جاں سے

لکھائی "طرح" میں محدود کر کے پھر غزل مجھ سے
خدا اے جوشؔ سمجھے شاعرانِ سست پیماں سے

سنہ ۱۹۲۱ء

کس قدر آئینۂ تائیدِ ہر تردید ہے
شرک بھی دیکھا تو اک بھٹکی ہوئی توحید ہے

دے انھیں جنبش کبھی عہدِ وفا کے واسطے
تیرے ہونٹوں میں نہاں میرا ہلالِ عید ہے

کس قدر پختہ ہے تیرا وعدۂ دیدار بھی
ہر طلوعِ صبح تیرے عہد کی تجدید ہے

سوچئے کیا چیز ہوگی اس کی صبحِ آرزو
جس کی شامِ نامرادی صبحِ صد اُمید ہے

مشہدیؔ[1] مرزا میں پنہاں ہے عجب کیفِ جنوں
ایسے دیوانے سے ملنا جوشؔ اپنی عید ہے!

سنہ ۱۹۲۶ء

گر ان میں ہیں وہ باتیں نہیں گردش میں ہیں پیمانے
کیا دین ہے، کیا دنیا، شاعر کی بلا جانے

سن لیجئے فرصت ہے، پھر کیا ہو خدا جانے
کب سے ہیں مرے دل میں بیتاب کچھ افسانے

کچھ سیکھ سکیں شاید آبادیاں شہروں کی
اے راہرو! ٹھہرو، کچھ کہتے ہیں ویرانے

مطرب! وہ اٹھے پردے، ساقی، وہ کھلے مے کدے
ہاں یونہی دمادم دے پیمانوں پہ پیمانے

ہم عشق سے کیا واقف، واقف ہیں تو صرف اتنا
آغاز ہلاکت ہے، انجام خدا جانے

جو غنچۂ و شبنم تھے کل رات کے ہونٹوں پر
اب صبح کے کانوں پر نشتر ہیں وہ افسانے

اے جوشؔ الجھتا ہے کیوں شیخ سبک سر سے؟
یہ عشق کو کیا سمجھے، یہ حسن کو کیا جانے

---

[1] احسن مرزا صاحب شرر مشہدی لکھنوی، جو مصنف کے بہترین احباب میں سے تھے۔
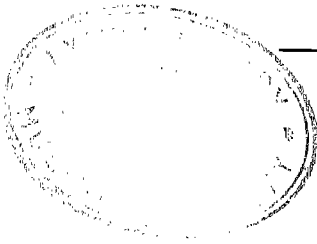
۱۹۲۶ء

کیا کہیں وہ رازِ پنہانی، جو اپنے دل میں ہے
آہ اُس خنجر کی عُریانی، جو اپنے دل میں ہے

کس کو سمجھائیں؟ کہ ماخذ ہے چراغِ طُور کا
یہ ہجُومِ شُعلہ سامانی، جو اپنے دل میں ہے

ڈالتی ہے رُعب سے حکمت پر حقارت سے نگاہ
رازِ عالم پر یہ حیرانی، جو اپنے دل میں ہے

شہپرِ جبریل کو پرواز کا دیتی ہے درس
یہ تصوّر کی پر افشانی، جو اپنے دل میں ہے

کون مانے گا؟ کہ ہے افسُردۂ مژگانِ تر
یہ مسرّت کی فراوانی، جو اپنے دل میں ہے

۱۹۲۷ء

محلِّ شکوہ نہیں ہے جہاں کی بُوالعجبی
کہاں تک اے دلِ ناداں! یہ مشقِ بے ادبی؟

نظام دہر ہے اضداد کے توازن پر
سحر کا لحن ہے پیکِ سکُوتِ نیم شبی

ازل کے نور سے ظُلمت ہے نُور کی بُنیاد
کہ خاکِ تیرہ ہے صنّاعِ شیشۂ حلبی

تجھے خبر بھی ہے ناداں کہ مثلِ روغن ہے؟
چراغِ مصطفوی کو ہوائے بُولہبی

سنہ ۱۹۲۵ء

نہ چھیڑ شاعر! ربابِ رنگیں، یہ بزم ابھی نکتہ داں نہیں ہے
تری نوا سنجیوں کے شایاں فضائے ہندوستاں نہیں ہے

تری سماعت، نگارِ فطرت کے لحن کی رازداں نہیں ہے
وگرنہ ذرہ ہے کون ایسا کہ جس کے مُنہ میں زباں نہیں ہے

زباں پہ ہیں صوفیوں کی یارب! یہ کیسی بے مغز اصطلاحیں
زمیں کے پردے پہ ماسوٰی کا کہیں بھی نام و نشاں نہیں ہے

اگرچہ پامال ہیں یہ سجدیں، مگر سُخن ہے بلند، ہمدم
نہ دل میں لانا گمانِ پستی، مری زمیں "آسماں" نہیں ہے

ضمیرِ فطرت میں پرفشاں ہے چمن کی ترتیبِ نو کا ارماں
خزاں جسے تُو سمجھ رہا ہے وُہ درحقیقت خزاں نہیں ہے

حریمِ انوارِ سرمدی ہے ہر ایک ذرّہ بہ رتبِ کعبہ
مرا یہ علمی مشاہدہ ہے، فریبِ وہم و گماں نہیں ہے

ہر ایک کانٹے پہ سرخ کرنیں، ہر اک کلی میں چراغ روشن
خیال میں مسکرانے والے! ترا تبسم کہاں نہیں ہے؟
فلک سے ہنگامِ شعر گوئی، صدائیں پیہم یہ آ رہی ہیں
کہ آج اے جوشِ نکتہ پرور! ترا سا جادو بیاں نہیں ہے

سنہ ۱۹۲۷ء

ٹھہر! کہ عبرت کے کارخانے ہر ایک ذرّے میں ہیں یہاں کے
نہیں یہ قبریں "نشانِ پا" ہیں حیاتِ فانی کے کارواں کے
میں اس کی گہری نظر کے صدقے، میں اس کے ذوقِ طلب کے قرباں
تری تجلی جو دیکھتا ہے دھوئیں میں اس تیرہ خاکداں کے
چمکتے ہیں شب کو ماہ و اختر، جھلکتا ہے صبح شاہِ خاور
پرستش ان کی کروں نہ کیونکر، یہ نشاں ہیں میرے بے نشاں کے
نہ پوچھ راحت پرست! کیونکر کھلا ہے یہ بھید میرے دل پر؟
کہ اشک بہنے سے ٹوٹتے ہیں طلسمِ نیرنگیِ جہاں کے
یہ رازِ حق ہے، نہ کھل سکے گا کبھی ترے کبرِ خود نما پر
کہ خاکِ افتادگی کے اندر دریچے کھلتے ہیں آسماں کے

نوائے بلبل، سرودِ قمری، میں سر دھنوں کیوں نہ جوشؔ ان پر
کہ ہیں یہ کچھ یادگار "فقرے" کسی کی شیرینیٔ بیاں کے

۱۹۲۳ء

رسمِ خرد سے ارتباط، روح کو وجہِ ننگ ہے
پائے جنوں اُدھر نہ جا، دشتِ شعور تنگ ہے

اُس کا جمال چھوڑ کر، اس سے بہشت مانگنا
تیری نظر میں ہو ہنر، میرے لئے تو ننگ ہے

عشق کا دل ضرور ہے فرطِ جنوں سے بے ادب
حسن اگر خطا معاف تو بھی تو شوخ و شنگ ہے

بات ہے جوشؔ ایک ہی فرق ہے حسن و عشق کا
میری جبیں کی خستگی اُن کی جبیں پہ رنگ ہے

۱۹۲۴ء

شکرِ ایزد کہ دل کی بینائی
بن گئی مایۂ ظفر یابی

وائے قسمت کہ اپنی جنسِ ہنر
ہیچ ہے با وجودِ نایابی

پست ہے میرے سازِ وحشت سے
نغمۂ بوعلی و فارابی

نھک چکی ہیں رسالتیں کیا کیا
بل بے انساں کا ذوقِ سیرابی

یاد آتا ہے آگرہ اے جوشؔ
ہائے وہ چاندنی، وہ مہتابی

۱۹۲۳ء

دلوں کو شامِ الم بنا دے، شبوں کو محرومِ خواب کر دے
تجھے قسم حسنِ دوست! مجھ کو رہینِ صد پیچ و تاب کر دے

نقاب اُٹھا دے رُخِ جانستاں سے، دلوں کی دُنیا میں ہو اُجالا
اُداس ذرّوں پہ مسکرا کر نگاہ کر، آفتاب کر دے

مجھے حقیقت سے آشنا کر، دلوں کو تسکین دینے والے!
ہر ایک کانٹے کو زندگی کے، مری نظر میں گلاب کر دے

کھلے ہوئے ہیں فلک پہ تارے، تجھے قسم اُن کی سادگی کی
مری شبِ تار کو بھی یارب! کبھی شبِ ماہتاب کر دے

مقام طے ہو رہے ہیں میرے، ہٹا نہ آئینے سے نگاہیں
مجھی پہ صرف اے سنورنے والے! تمام زورِ شباب کر دے

حریمِ جاناں میں باریابی کی جوش اگر تجھ کو آرزو ہے
جگا دے غفلت سے بیخودی کو، خرد کو مصروفِ خواب کر دے

سنہ ۱۹۲۴

جلا کے میری نظر کا پردہ، ہٹا دی رُخ سے نقاب تُو نے
چراغ اُٹھا کر مرے شبستاں میں رکھ دیا آفتاب تُو نے

فلک نظر سے تڑپ رہا ہے، زمین عشووں سے ہل رہی ہے
کہاں سے پایا ہے او ستمگر! یہ مست و کافر شباب تُو نے

نسیم اوراق اُلٹ رہی ہے، نجوم مشعل دکھا رہے ہیں
اُفق کی سُرخی میں پیش کی ہے سحر کی زرّیں کتاب تُو نے

مَیں اپنے سینے میں تجھ کو رکھ لوں، اِدھر تو آ اے سحابِ رنگیں
زمیں پہ ٹپکائیں رس کی بوندیں، فلک پہ چھڑکی شراب تُو نے

زمیں کی جانب نظر جھکا کے کل ایک شاعر یہ کہہ رہا تھا
ہر ایک ذرّے کو مسکرا کر بنا دیا آفتاب تُو نے

جو باخبر تھے، وہ مُسکرائے، جو بے خبر تھے، وہ کچھ نہ سمجھے
اُٹھا کے بیگانہ وار آنکھیں، کیا وہ مجھ سے خطاب تُو نے

ترے نثار اے نگاہِ ساقی! ترے تصوّر میں کیوں نہ جھوموں
کہ اپنے پرتو کو میرے دل میں بنا دیا ہے شراب تُو نے

پلٹ گئیں اشک بن کے نظریں، گرا با جیسے ہی تُو نے پردہ
برس پڑیں سینکڑوں نگاہیں، ذرا جو اُلٹی نقاب تُو نے
نہ ہوگا تجھ سا بھی لاابالی، خُدا کی رحمت ہو جوشؔ تجھ پر
سحر کو کیا کیا ضرورتیں ہیں، کبھی نہ دیکھا یہ خواب تُو نے

۱۹۲۵ء

شب، تصوّر نے یہ بخشا اوجِ رُوحانی مجھے — اپنے قدموں پر ملی گردوں کی پیشانی مجھے
جا کے گوشے میں کسی صحرا کے رو لیتا ہوں میں — یاد آتی ہے جو اپنے گھر کی ویرانی مجھے
آسمانوں کی بلندی دیکھتی ہے راستہ — خاک سے اُٹھنے نہیں دیتی تن آسانی مجھے
باغؔ[1] نے لکھوائی مجھ سے طرح دیکر یہ غزل — کچھ پشیمانی اُنہیں ہے کچھ پشیمانی مجھے
اے چٹکتی صبح کی بیداریو! رحم، رحم — یاد دلواتی ہو یہ کس کی خوش الحانی مجھے
دفترِ عالم کا راز اِک سطر میں سمجھا دیا — جادۂ عرفاں ہے تیری چینِ پیشانی مجھے
وُہ مقامِ اتصال آیا ہے اے یادِ حبیب! — سب سے پہلے اب تری کرنا ہے قُربانی مجھے

لکھنؤ کیا چھُٹ گیا، اے جوشؔ دُنیا چھُٹ گئی
اب کہاں مُمکن وُہ سامانِ غزل خوانی مجھے

---

[1] میر کاظم علی صاحب باغؔ جو میرے ہونہار دوست حضرت اخترؔ کے والد ہیں+

سنہ ۱۹۲۳ء

میرے حواس لے لیے یار کی چشمِ مست نے
فتح کا تاج رکھ دیا سر پہ مرے شکست نے

طعنۂ خودسری دیا عشقِ جنوں پرست نے
راہِ وفا میں کھو دیا فکرِ بلند و پست نے

سر پہ ترے رہیں سدا پھولوں کے تاج فصلِ گل!
روح کو مست کر دیا تیری ہوائے مست نے

نظمِ عبودیت پڑھی میں نے کچھ ایسے لحن سے
ہنس کے رباب اُٹھا لیا نغمہ زنِ الست نے

آگے ہماری آنکھ میں اشک نہ کیوں تھمے رہیں
درس دیا ہے آپ کی چشمِ حیا پرست نے

جا کے نسیمِ جانستاں! کہنا یہ بزمِ حُسن میں
بھیجا ہے تحفۂ سلام جوشِ سحر پرست نے

سنہ ۱۹۲۶ء

اے دورِ ہوس پرور، اے عہدِ ریاکاری!
کیا شرع میں تیری بھی جائز نہیں مے خواری

اندھوں کو دکھا جلوے، بہروں کو سُنا نغمے
قدرت نے مرے حق میں یہ حکم کیا جاری

کیا جبر ہے کیا مد ہے کیا دورِ تسلسل ہے!
دشواری و آسانی، آسانی و دشواری

اے جانِ وفا! کب تک اے رُوحِ کرم آلکے؟
یہ صبح کی فریادیں، راتوں کی یہ بیداری

پردہ اب اُٹھایا ہے سلمائے محبت نے
کاندھے پہ مرے رکھ دو تابوتِ ہوس کاری

معبود طلب کر لے قدرت کے مناظر کو
کافر ہوں اگر خود سے کی ہو کبھی مے خواری

کس حد کی جنوں پرور شرطیں ہیں محبت کی — خاموشی و گویائی ، ہشیاری و سرشاری
اے شرمِ گنہ تجھ سے بے کار الجھنا ہے — یارانِ طریقت کا پندارِ نکوکاری
یہ عیش کی صورت ہے، وہ لطف کا ساماں ہے
اے جوش کھلونوں کی تا چند خریداری؟

سنہ ۱۹۲۸ء

وہ جوششِ خیرگی ہے تماشا کہیں جسے — بے پردہ یوں ہوئے ہو کہ پردا کہیں جسے
اللہ ری خاکساریٔ رندانِ بادہ خوار — رشکِ غرورِ قیصر و کسریٰ کہیں جسے
بجلی گری وہ دل پہ جگر تک اتر گئی — اُس چرخِ ناز سے قدِ بالا کہیں جسے
زلفِ حیات نوعِ بشر میں ہے آج تک — وہ جرمِ گناہِ آدم و حوّا کہیں جسے
کتنی حقیقتوں سے فزوں تر ہے وہ فریب — دل کی زباں میں وعدۂ فردا کہیں جسے
میرا نفس ہے جس کا لقب ہے نسیمِ زلف — میری نظر ہے چہرۂ زیبا کہیں جسے
وہ بھی ہے ایک اصل میں بہکی ہوئی وفا — اہلِ جہاں عداوتِ اعدا کہیں جسے
لو آ رہا ہے وہ کوئی مستِ خرامِ ناز — اس چال سے کہ لغزشِ صہبا کہیں جسے
مسندِ نشاطِ خانۂ امروز میں نہیں — وہ بزدلی کہ خطرۂ فردا کہیں جسے
خنجر ہے جوش، ہاتھ ہیں، دامن لہو سے تر — یہ اُس کے طور ہیں کہ مسیحا کہیں جسے

سنہ ۱۹۲۶ء

دلِ تمنّاؤں سے یوں دُور ہوا جاتا ہے
حُسن تعظیم پہ مجبور ہوا جاتا ہے

اتنی قربت پہ بھی یہ ناز ہے اللہ اللہ
مجھ سے ہر سانس میں وہ دُور ہوا جاتا ہے

مائلِ سجدہ ہوئے جاتے ہیں خوبانِ جہاں
جوشؔ یوں عشق پہ مغرور ہوا جاتا ہے

سنہ ۱۹۲۵ء

کافر بنوں گا، کفر کا ساماں تو کیجیے
پہلے گھنیری زلف پریشاں تو کیجیے

اس نازِ ہوش کو کہ ہے موسیٰ پہ طعنہ زن
اک دن نقاب اُلٹ کے پشیماں تو کیجیے

عُشّاق بندگانِ خُدا ہیں، خُدا نہیں
تھوڑا سا نرخِ حُسن کو ارزاں تو کیجیے

قدرت کو خود ہے حُسن کے الفاظ کا لحاظ
ایفا بھی ہو ہی جائیگا پیماں تو کیجیے

تا چند رسمِ جامہ دری کی حکایتیں؟
تکلیفِ یک تبسّمِ پنہاں تو کیجیے

یُوں سر نہ ہو گی جوشؔ کبھی عشق کی مُہم
دل کو خرد سے دست و گریباں تو کیجیے

سنہ ۱۹۲۸ء

فقیہہ شہر! مناسب نہیں یہ حیلوی گری ۔۔۔ کہ ادعائے خبر ہے کمالِ بے خبری
علاج دل کا کروں کیا، اگرچہ واقف ہوں ۔۔۔ کہ برقِ خرمنِ ہستی ہے ذوقِ دیدہ دری
رفیق! جام اٹھا، ذکرِ مدعی موقوف ۔۔۔ کسے ہے فرصتِ بغض و دماغِ کینہ دری
فغاں کہ فکر کو میری ملا ہے وہ بازار ۔۔۔ جہاں متاعِ ہنر سے گراں ہے بے ہنری
تجھے جراحتِ دل کی ہے فکر کیوں اتنی؟ ۔۔۔ کہ خود ہے وقت کی فطرت میں ذوقِ بخیہ گری
ہزار نغمۂ رنگین و رقصِ بادِ مراد ۔۔۔ فدائے نالۂ شبگیر و گریۂ سحری

سکوتِ شب میں پہنچتا ہے دل وہاں اے جوش
کہ چھوٹتی ہے جہاں نبضِ آدمی و پری

سنہ ۱۹۲۵ء

حکم تو یہ ہے کہ اک وضع پہ ہو نظمِ جہاں ۔۔۔ چاہتے یہ ہو کہ آویزشِ اضداد رہے
وائے وہ عیش مصیبت میں رہے جس کا خیال ۔۔۔ ہائے وہ رات جو ہنگامِ سحر یاد رہے
دعوتِ برق ہے تعمیرِ نشیمن کا خیال ۔۔۔ غمِ جاناں کا تقاضا ہے کہ دل شاد رہے

یہ بغاوت ہے جنوں سے کہ رہے پاسِ خرد
یہ ہے توہینِ جوانی کہ خدا یاد رہے

سنہ ۱۹۲۴ء

د اپنی زندگی سے وحشت سی ہوگئی ہے
طاری کچھ ایسی دل پہ عبرت سی ہوگئی ہے

طرب سے دل کو ہونے لگی ہے وحشت
کچھ ایسی غم کی جانب رغبت سی ہوگئی ہے

سینے پہ پھیرے جب سے رکھا ہے ہات تم نے
کچھ اور دردِ دل میں شدّت سی ہوگئی ہے

لیکن نہیں کہ مل کر رسماً ہی مسکرا دو
تم کو تو جیسے ہم سے نفرت سی ہوگئی ہے

اب تو ہے کچھ دلوں سے یوں دل بجھا بجھا سا
دونوں جہاں سے گویا فرصت سی ہوگئی ہے

وہ اب کہاں ہیں لیکن اے ہمنشیں یہاں تو
مڑ مڑ کے دیکھنے کی عادت سی ہوگئی ہے

اے جوشؔ رفتہ رفتہ شاید ہمارے دل سے
ذوقِ فسردگی کو اُلفت سی ہوگئی ہے

سنہ ۱۹۲۴ء

جب تک آنکھوں میں موجِ صہبا تھی
ذرّے ذرّے میں ایک دُنیا تھی

بارے اب ظلم پر تو مائل ہو
ورنہ تم سے اُمیّد ہی کیا تھی

رحم اُس عہد کے تصدّق میں
جب تمہیں خود مری تمنّا تھی

ہائے کس وقت یہ ہُوا معلوم
کہ تری آرزو نہ کرنا تھی

١٩٢٨ء

قسم ہے آپ کے ہر روز رُوٹھ جانے کی
کہ اب ہوس ہے اجل کو گلے لگانے کی

وہاں سے ہے مری ہمت کی ابتدا واللہ
جو انتہا ہے ترے صبر آزمانے کی

پھُنکا ہوا ہے مرے آشیاں کا ہر تنکا
فلک کو خُو ہے تو ہو بجلیاں گرانے کی

ہزار بار ہوئی گو مآلِ گُل سے دوچار
کلی سے خُو نہ گئی پھر بھی مسکرانے کی

مرے غرور کے ماتھے پہ آچلی ہے شکن
بدل رہی ہے تو بدلے ہوا زمانے کی

چراغِ دیر و حرم کب کے بُجھ گئے اے جوشؔ
ہنوز شمع ہے روشن شراب خانے کی

مُژدہ اے رندو کہ سرمستی کا ساماں آگیا
وہ ہوا سنکی وہ بارِ گُل بداماں آگیا

خوش ہو اے پیاسی زمیں وہ بُوندیاں ٹپنے لگیں
مُژدہ اے جوئے تنک مایہ کہ طوفاں آگیا

مِل کے ہاں اک نعرۂ اے رندو کہ وہ کافر جمال
رُخ پہ بکھرائے ہوئے زُلفِ پریشاں آگیا

ہاں اُٹھو مجرے کو یارو جام چھلکاتے ہوئے
بزم میں وہ صدرِ بزمِ بادہ خواراں آگیا

مِل کے ہاں اک سجدۂ شکرانہ اے رندانِ پاک
بوستاں میں وہ الٰہِ بادہ و باراں آگیا

بلبلوں کی نغمہ پردازی کا اب کس کو دماغ
بزمِ نائے و نوش میں یارِ غزلخواں آگیا

کس لئے اب کیجئے سیرِ گلستاں کی ہوس
حلقۂ جام و سبو میں خود گلستاں آگیا

دیکھئے اب کیوں دریچوں سے خرامِ ابر کو   مے کشوں کے پاس خود ابرِ خراماں آگیا

عشق! رقصاں ہو کہ آپہنچا پیامِ مرگِ تو
جوشؔ! سجدے کر کہ تیرا دشمنِ جاں آگیا

متاعِ حلقۂ ادراک و نقدِ عالمِ ہوش   فدائے ساقیِ ساغر بدست و زلف بدوش
زمانہ ذوقِ سماعت سے پی رہا ہے شراب   سنا رہی ہے وہ افسانہ چشمِ بادہ فروش
یہ بزمِ نیم شبی ہے یہ وقتِ رامش و رنگ   امامِ شہر! خبردار! محتسب! خاموش
ابھار رہے ہیں تلاطم شراب خانے میں   مغنّیانِ بہار و بتانِ عشوہ فروش
کئے ہوئے ہے زمان و مکاں سے بیگانہ   شمیمِ گل کا تلاطم صدائے نے کا خروش
کسی جبیں سے نمایاں نہیں وبائے خرد   کسی نگاہ میں باقی نہیں ملامتِ ہوش
اُبل رہی ہیں بہاریں برس رہی ہے شراب   مچل رہی ہے کلیجوں میں بانگِ نوشا نوش
شرابِ کہنہ و مہتاب و ساقیِ نوخیز   چمن میں آج یہ سب نعمتیں ہیں دوش بدوش
رگوں میں بادہ ہے پہلو میں یار سر پہ قمر   زمیں کنیز ہے آج آسمان حلقہ بگوش

نہ کیوں ہو مطربِ چرخ گوش بر آواز
اس آرزو میں کہ سن لے کلامِ حضرتِ جوشؔ

پھر حسنِ یار مائلِ اظہار ہو گیا
ہر ذرہ ایک مصر کا بازار ہو گیا

پھر زلف یوں کھلی کہ دل و دیدۂ جہاں
زنجیرِ رنگ و بو میں گرفتار ہو گیا

خوابیدہ بختیوں کا ستایا ہوا فراق
پھر روشناسِ دولتِ بیدار ہو گیا

پھر جلوۂ نگار بنا میرِ انجمن
پھر حسنِ یار قافلہ سالار ہو گیا

پھر موتیوں کو گوشِ وفا رولنے لگا
پھر لعلِ گل فروشِ گہربار ہو گیا

پھر تابشِ تبسمِ جاناں کے سامنے
کھلنا کلی کو باغ میں دشوار ہو گیا

پھر کم نگاہیوں کو ملی رخصتِ نظر
پھر نازِ التفات پہ تیار ہو گیا

پھر تولنے لگا خمِ گردن متاعِ ناز
پھر لوچ شاخِ نرم کا تلوار ہو گیا

وہ خونِ دل کہ سر تھا نبضِ حیات میں
پھر آشنائے گرمیِ رفتار ہو گیا

خلوت سے انجمن میں در آتے ہی وہ نگار
طوفانِ شہرِ فتنۂ بازار ہو گیا

آواز دو کہ جوش پہ فیضِ شرابِ ناب
ساقی کی مرحمت کا سزاوار ہو گیا

کتبہ: محمد شریف عباسی لاہور ۲ دسمبر ۱۹۴۴ء